شب رفتہ کے بعد



مجید امجد

شبِ
رفتہ
کے
بعد

بار اول : 1976

ناشر : جاوید قریشی

طابع : ارشد راج
ٹرپل سٹار پرنٹرز،
2 - لنک میکلوڈ روڈ - لاہور

مجید امجد اشاعتی کمیٹی
پنجاب آرٹ کونسل، لاہور

قیمت : ۲۰ روپے

مجید امجد

شبِ رفتہ

کے

بعد

نظمیں ۔ غزلیں

تیسری دنیا اشاعت گھر۔ لاہور

حرفِ معذرت

مجید امجد سے میری ملاقات اُن کی رحلت سے چند روز قبل ہوئی تھی - کسی نے اطلاع دی کہ امجد صاحب کی علالت زیادہ شدید ہوگئی ہے اور اُنھیں شفا خانے میں داخل کرانا ضروری ہے -

میں عیادت کو مجید امجد کے مکان واقع فرید ٹاؤن ساہیوال گیا اور انھیں نہایت لاغر لیکن نسبتاً ہشاش بشاش پایا - مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے البتہ ہسپتال میں داخل ہونے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اپنے معالج سے بالکل مطمئین ہوں اور روبصحت بھی، زیادہ زور دینا بے سود تھا - مجید امجد کسی کے زیر بار احسان ہونا تو جانتے ہی نہ تھے - دفتر کی الجھنوں میں مجید امجد کی بیماری اور صحت عارضی طور سے میرے ذہن سے محو ہوگئی - غالباً چوتھے یا پانچویں روز عصر کے لگ بھگ مجھے اطلاع ملی کہ مجید امجد کا انتقال ہو گیا - اب فوری طور پر مسئلہ یہ اٹھا کہ انھیں دفن کہاں کیا جائے - ساہیوال میں جہاں اُنھوں نے ایک عمر بتائی یا جھنگ میں جو اُن کا آبائی وطن تھا - باہمی صلاح و مشورے سے یہی طے پایا کہ اُن کی میّت کو جھنگ بھجوا دیا جائے - اب کسی کو اُن کا جھنگ کا پتہ معلوم نہ تھا - میں نے ڈپٹی کمشنر جھنگ کے توسط سے شیر افضل جعفری سے رابطہ پیدا کیا تو معلوم ہوا کہ مجید امجد کی موت کی خبر وہاں پہنچ چکی ہے -

سٹیڈیم ہوٹل ساہیوال کے بابا جوگی نے ، جو اب خود بھی مجید امجد کی طرح اس دنیا میں نہیں ہیں اور جن کے ہوٹل میں مجید امجد نے بہت وقت گزارا تھا ، ایک ٹرک کا بندوبست کر دیا - اس ٹرک کو جب میں نے دیکھا تو مجھے بہت ہی رنج ہوا - ایک تو امجد صاحب کی موت خود ہی کوئی چھوٹا سانحہ نہ تھی - دوسرے جس بے سرو سامانی میں انھوں نے جان دی وجہء کرب بنی ہوئی تھی اور پھر یہ ٹرک جس میں امجد صاحب کی میّت کو ساہیوال اور جھنگ کے درمیان آخری سفر طے کرنا تھا، گندگی اور غلاظت سے پاک نہ تھا - غالباً اُسے مویشیوں کی بار برداری

کے لیے استعمال کیا جاتا تھا - چنانچہ میں نے ٹرک کو دھلوایا اور صاف کروا کے ایک دری اُس میں بچھوا دی - ادھر اُدھر برف کی سلیں رکھوا کے ٹرک کو مجید امجد کی میّت کے لیے تیار کروا لیا گیا - اس دوران میّت باہر لائی جا چکی تھی - ایک تکیہ جو میں نے بالکل غیر ارادی طور پر میّت کے سرہانے رکھوا دیا ایک بزرگ خاتون کے یہ کہنے پر نکلوا دیا گیا کہ میّت کے سرہانے تکیہ نہیں رکھا جاتا - پندرہ بیس افراد نے جن میں ایک بھی مجید امجد کا دوست نہ تھا اور جو خدا جانے اُس جگہ میّت کی خبر سن کر جمع ہو گئے تھے یا ڈپٹی کمشنر کی موجودگی دیکھ کر، مجید امجد کو خدا حافظ کہا، مغرب کے وقت ٹرک امجد صاحب کی میّت اُن کے دیرینہ ملازم کی نگرانی میں لے کر جھنگ کے لیے روانہ ہوا -

مجید امجد مر گیا - اُس کا بے شمار غیر مطبوعہ کلام باقی تھا - احباب کے کہنے پر میں نے خود اُسے محفوظ کر لینے کا فیصلہ کیا - مجید امجد کے مکان کو مقفل کرکے چابی میں نے خود اپنے پاس رکھ لی ، بعد میں ایک کمیٹی امجد علی آغا پرنسپل گورنمنٹ کالج ساہیوال کی زیر نگرانی میں تشکیل اس غرض سے دے دی کہ تفصیل سے گھر کا جائزہ لیں اور ہر اس چیز کو محفوظ کر لیں جو قابل اشاعت ہو - چنانچہ بے شمار نظمیں ، غزلیں اور خطوط ایک گٹھڑی میں باندھ کر میرے حوالے کر دئیے گئے جو میں نے یونائیٹڈ بنک ساہیوال کے ایک لاکر میں محفوظ کرا کے چابی خود رکھ لی - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بعد گویا ساہیوال میں میرا مشن پورا ہو چکا تھا - کوئی ایک مہینے کے بعد میرا تبادلہ ساہیوال سے لاہور بطور سکریٹری خوراک و امداد باہمی حکومت پنجاب ہو گیا -

میں نے پہلی ہی ملاقات میں اُس وقت کے وزیر اعلیٰ حنیف رامے صاحب سے عرض کیا کہ ایک کمیٹی تشکیل کر دیں تا کہ مجید امجد کے کلام کو چھپوایا جا سکے - رامے صاحب نے ، جو خود بھی مجید امجد سے ناواقف نہ تھے، اپنے پریس سکریٹری کی سرکردگی میں ایک کمیٹی تشکیل تو کر دی لیکن یہ فعال نہ بن سکی غالباً اس کا صرف ایک اجلاس ہوا جس میں' میں شریک نہ ہو سکا تھا - اس کے بعد مسلسل تگ و دو کے باوصف کچھ حاصل نہ ہو سکا - اِدھر سب لوگ یہ سمجھتے رہے کہ مجید امجد کا کلام اگر چھپ نہیں رہا ہے تو اس میں میرا کوئی قصور ہے -

رامے صاحب کی سبکدوشی کے بعد نواب صادق قریشی وزیر اعلیٰ ہوئے۔ میں نے پہلی ہی ملاقات میں اس طرف آپ کی توجہ مبذول کرائی۔

ابتدائی دقتوں کے بعد دس ہزار کی رقم پنجاب کونسل آف آرٹس کے سجاد حیدر صاحب کی طرف سے موصول ہونے پر ایک اور سب کمیٹی جس میں میرے علاوہ امجد اسلام امجد اور عبدالرشید بھی شامل تھے، نے بہ سرعت کام کرنا شروع کر دیا۔ میرے کلام انتخاب کر لینے کے بعد کاغذ کی خرید اور پبلشر کی تلاش شروع ہوئی۔ جب چھپائی شروع ہوئی تو پروف ریڈنگ کا مرحلہ آیا۔ اس میں افتخار جالب، عبدالرشید، سعادت سعید، فہیم جوزی اور محمد افضل پیش پیش تھے۔ ان جوانوں کی کوشش ہی اصل میں اس کتاب کی چھپائی کی ضامن بنتی ہے۔ رہا سوال میرا تو میں نے صرف اتنا کیا ہے کہ اس لا زوال کلام کو ضائع نہیں ہونے دیا جو مجید امجد کا حصہ ہے۔ اس کتاب میں اگر کوئی خوبی نظر آئے تو قارئین اسے رشید اور فہیم جوزی کی محنت اور لگن سے تعبیر کریں اور اگر کوئی خامی ہو تو میری کوتاہی سمجھ کر فروگذاشت سے کام لیں۔ بہر حال میں خوش ہوں کہ ایک اہم فریضہ سے سبکدوش ہوا اور بقول فیض ع

وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

امجد کی صحیح عظمت تو مستقبل کا نقاد ہی معین کرے گا۔ سر دست صرف اتنی گزارش کر دوں کہ میری دانست میں مجید امجد اردو زبان کے عظیم شاعروں میں آج بھی شامل ہے اور ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ امجد کا فن خود اس کی ذات کی طرح سدا زندہ و جاوید رہے گا۔

جاوید قریشی

2 مئی 1974

عرضِ مرتب

جناب جاوید احمد قریشی صاحب نے جو مسودات مجھے دیئے ان کی تفصیل یہ ھے : ایک رجسٹر جس کے صفحات پر نمبر شمار نہیں ہیں - اس کے پہلے صفحے پر امجد صاحب کی ایک تصویر ہے جس کے نیچے ۱۹۳۶ کا سن لکھا ہے - پہلے صفحے پر نظم بعنوان ناکام درج ہے اور دوسری نظم حسن ۱۹۳۶ ہے جو ان کے مجموعہ کلام شبِ رفتہ میں شامل ہے - رجسٹر کے تقریباً ۳۸۰ صفحات پر نظمیں اور غزلیں درج ہیں - ان میں ان کے کالج کا کلام اور ایسی نظمیں مثلاً ٹیگور کا نوحہ بائرن اور شیلے کی نظموں کے تراجم ، ماہنامہ عروج کی ادارت کے دوران غزلیں - ایک مثنوی (شہر مکہ بتوں کی بستی ہے) اور اس کلام کا ایک وقیع حصہ ہے جو اب شبِ رفتہ میں شامل ہے - اس رجسٹر میں آخری نظم ریوڑ ۳۰ مئی ۱۹۵۷ ہے اور آخری صفحات پر مکمل کوائف زندگی ہیں جو تاریخ پیدائش ۲۹ جون ۱۹۱۴ سے لیکر ریٹائرمنٹ ۲۹ جون ۱۹۷۲ تک ہیں - تین فائلیں ، جن میں سے ایک فائل میں انکے اپنے فوٹو اور محکمے کے گروپ فوٹو ہیں - دوسری فائل میں متفرق مسوداتِ نثر اور وہ نظمیں ہیں جن کو بار بار بنایا گیا ہے - اور تیسری فائل میں ان کی وہ نظمیں جو وہ بغرض اشاعت محفوظ کرنا چاہتے تھے، اس میں سن وار ۱۹۵۱ سے لیکر ۱۹۷۳ تک کی نظمیں محفوظ ہیں - اس میں ایک حصہ ان نظموں کا ہے جس میں ۱۹۵۱ تا ۱۹۶۰ تک کی وہ نظمیں ہیں جو شبِ رفتہ میں شامل نہیں ہیں - دوسرے حصے میں ۱۹۶۱ تا ۱۹۶۳ تک ، تیسرے حصہ میں ۱۹۶۳ تا ۱۹۶۶ اور پھر اسکے بعد ۱۹۶۸ سے لے کر ۱۹۷۳ ہر سال کی ایک علیحدہ فائل ہے -

چار لفافوں کے بنڈل جن میں احباب کے خطوط ہیں ، اور بہت ساری ادھوری نظمیں ہیں یعنی ایسی نظمیں جو شروع کی گئیں مگر مکمل نہ ہوئیں کچھ ٹکڑے ان میں صرف چند مصرعوں پر مشتمل ہیں - بعض تقریباً

مکمل نظمیں ہیں - ایک لفافے میں جرمن سیاح لڑکی شالاط کے خطوط اور اس کی تصویریں ہیں - ایک رنگین تصویر ہے جس میں وہ تنکوں کا ہیٹ پہنے ہوئے کشتی پر بیٹھی ہے - اور ان کی نظم ایک فوٹو (صفحہ نمبر ۷۹) اسی تصویر کی تفصیلات کے متعلق ہے -

مسودات کا ایک وہ بنڈل ہے جس میں وفات سے پہلے انہوں نے وہ ساری نظمیں جو وہ اشاعت کی غرض سے محفوظ کرنا چاہتے تھے، صاف کر کے لکھ دی تھیں لیکن یہ کام وہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے - اس کے علاوہ ایک فہرست کی فائل ہے جس میں وہ ساری نظمیں درج ہیں جو انہوں نے ایک فائل میں سن وار مرتب کرکے محفوظ کی ہیں -

اس کتاب کا اصل مآخذ رجسٹر اور سن وار فائل میں درج شدہ نظمیں ہیں - اس مجموعے کی ابتدائی ۱۶ نظمیں جو ۱۹۴۲ سے لے کر ۱۹۵۷ تک کی ہیں اس کلام پر مشتمل ہیں جو انہوں نے شبِ رفتہ کی ترتیب کے زمانے سے رد کر دیا تھا - اور اسے دوبارہ پھر فہرست کی فائل میں شامل نہیں کیا - لیکن جو میں نے امجد اسلام امجد سے مل کر صرف اس غرض سے انتخاب کیا ھے کہ یہ مجموعہ ان کی ابتدائی کاوشوں سے لے کر ان کی آخری عمر تک کی شاعری کا احاطہ کر سکے -

ایک طرح سے یہ مجید امجد کی نظموں کا مکمل ترین مجموعہ ہے اور ایک طرح سے نہیں - مکمل اس لیے کہ شبِ رفتہ کے بعد کی ہر نظم جو ہمیں متفرق مسودات سے دستیاب ہوئی وہ اس میں درج ہے - اور مکمل اس لئے نہیں کہ ان کا بیشتر کلام جو انہوں نے شب رفتہ میں شامل نہیں کیا اس میں سے ہم نے بھی صرف چند نظمیں نمونے کے طور پر شامل کی ہیں - اس طرح تقریباً سارا ابتدائی کلام شامل ہونے سے رہ گیا - اور وہ ایک الگ کتاب کی حیثیت سے شائع کیا جائے گا -

چونکہ ان کی بیشتر نظموں کے نیچے تاریخ درج ہے اس لیے اس کتاب کو سن وار مرتب کیا گیا ہے - جہاں جہاں سن یا تاریخ نہیں ہے - اس کو اندازے سے نظموں کے اسی طرح کے گروہ میں تاریخ اشاعت کے حساب سے شامل کیا ہے -

مجید امجد کی یہ دیرینہ کوشش تھی کہ وہ نظموں کو مسلسل بناتے رہتے تھے اس لئے مسودات میں ایک ایک نظم کی بیشتر مختلف صورتیں ملتی ہیں - ہم نے آخری مآخذ کے طور پر، جو نظمیں مرنے سے پہلے انہوں نے صاف کی ہیں ان کو لیا ہے - اس لیے کہ اکثر انہوں نے شائع شدہ نظموں کو بھی بنایا ہے - یا مصرعے حذف کیے ہیں یا سطروں کی ترتیب بدلی ہے - ان مسودات کے باوجود بہت ساری ایسی نظمیں ہیں جو ان کے پاس نہیں تھیں - جو رسائل و جرائد میں شائع ہوئیں - وہ ہم نے نقل کر کے اس مجموعے میں شامل کی ہیں - اس سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ ممکن ہے اس طرح اور بھی کئی نظمیں ہوں، جو ادھر اُدھر بکھری ہوئی ہوں -

عبدالرشید

16 مئی 1976

فہرست

1

راجا پرجا

راجے کا کل آج
سارا جہاں محتاج
اس کی چال رواج
تن کی سیل ساج
سکھ، دھن، باج خراج
گدی، مسند، تاج
تیس برس کا راج

———————— اور پھر اس کے بعد
اک روضۂ ویراں!

پرجا کا آج نہ کل
شاخ نہ پھول نہ پھل
بھٹکے دَل کا دَل
بھوکا، پیاسا، شل
لاکھ برس کا پل

———————— اور پھر اس کے بعد
مٹتے گورستاں!

راجا، پرجا، کہاں؟
اک بہتا طوفاں
کوہِ عظیم و گراں —
کاہِ سبک ساماں

جھونپڑیاں ، ایواں
نغمہ اور فغاں
ہر شے اس میں رواں
ہر شے اس میں نہاں

——— اور پھر اس کے بعد
ایک وہی طوفاں !

19 دسمبر 1942

کون

چاندی کی پازیب کے بجتے گھنگھروؤں سے کھیلے
ریشم کی رنگیں لُنگی کی سرخ البیلی ڈوری

نازک نازک پاؤں برقع کو ٹھکراتے جائیں
چھم چھم بجتی جائے پائل، ناچتی جائے ڈوری

ہائے سنہری تِلّے کی گلکاری والی چپلی
جس سے جھانکے مست سہاگن مہندی چوری چوری

جانے کتنی سندر ہو گئی روپ‌نگر کی رانی
اُف چپلی میں سکڑی سکڑی اُنگلیاں گوری گوری

جھونکوں کی خوشبو، دروں میں نور لٹاتی جائے
مجھ بھاگوں کے مارے کی قسمت کوری کی کوری

20 دسمبر 1942

ارتھی

تو نے کیا دیکھا ؟ تو نے کیا سمجھا ؟
جب تری زندگی نواز آنکھیں
گوشۂ بام کی بلندی سے ،
فرطِ حیرت سے ، دردمندی سے ،
جھک پڑیں اُس ہجومِ گریاں پر
جو گزرتا تھا تیرے کوچے سے
ایک ارتھی اُٹھائے شانوں پر
چند سہمے سے پھول اور اک چادر
زندگی کی بہار کا انجام
بحرِ ہستی کی آخری منجدھار
تیرے حسن اور مرے جنوں کا مآل
اپنا احساس تھا کہ میرا خیال
میں نے دیکھا تو سوگوار سی تھی
تو نے کیا سوچا تو نے کیا سمجھا

12 جنوری 1943

ہزاروں راستے ہیں......

ہزاروں راستے ہیں منزلیں ہیں
سمندر اور صحرا بھی ہیں حائل
مگر رہبر ستارے کی شعاعیں
ہیں ہر رہرو کے سینے کی قباعیں
ہر اک کشتی سمجھتی ہے کہ تارا
رواں ہے ساتھ اس کے بن کے رہبر

تمہاری رہ، مری منزل الگ ہے
تمہارے دل سے میرا دل الگ ہے
سمندر اور صحرا ان میں حائل
کسے معلوم ہے یہ دو مسافر
کبھی اک دوسرے سے مل سکیں گے
کبھی شاید یہ غنچے کھل سکیں گے
مگر دونوں کا رہبر ہے وہ تارا
جو اک دن میرے حرفِ آرزو پر

تمہاری انکھڑیوں سے گر پڑا تھا
جبینِ وقت پر تاباں ہوا تھا

شب و روز آئے اس کے بعد لاکھوں
ابھی تک اس کی کرنوں کے اشارے
صدا بھٹکے ہوؤں کو دے رہے ہیں
ہماری کشتیوں کو کھے رہے ہیں
ہمارے راستے کتنے الگ ہوں
ہماری منزلیں کتنی جدا ہوں

مگر رہبر ستارا تو وہی ہے
اُمیدوں کا کنارا تو وہی ہے

18 جنوری 1943

زندانی

دردوں کے مارے دو قیدی
زنجیروں کی پھنکاروں میں
اک غم گیں سا اک حیراں سی

کالی کالی کوٹھڑیوں میں
دونوں کی نظروں پر پہرے
ہونٹوں پر مہریں چسپاں سی

لاکھوں آرزوئیں اُمیدیں
دوزخ کے ناگوں کی صورت
سینوں میں غلطاں غلطاں سی

سہمے سہمے قدموں کی
آہٹ کان میں آجاتی ہے
آہٹ مدھم سی، بے جاں سی

تو اک چرخے کی گھوں گھوں میں
گم سی ہو کر رہ جاتی ہے
خوفزدہ، پُر معنی کہانسی

پھر وہی جلادوں کی نگاہیں
پھر وہی سنگینوں کی نوکیں
پھر وہی خنجر، پھر وہی پھانسی

11 مئی 1943

ریڈنگ روم

میز پر اخبار کے پھیلے ورق
بکھرے بکھرے تیرہ تیرہ چاک چاک
ڈھل گئی ہے قالبِ الفاظ میں
سنیۂ ہستی کی آہِ درد ناک

پاس ہی دیوار کو ٹیکے ہوئے
ریڈیو گرمِ سخن محوِ بیاں

چیختی ہیں جامۂ آواز میں
خون کے چھنٹے لہو کی بوندیاں

شام ریڈنگ روم کی مغموم شام
چند کان، اعلانچی کی بات پر
چند آنکھیں، سوچ میں ڈوبی ہوئیں
مرتکز، اخبار کے صفحات پر
ایک کمرے میں سمٹ کر آ گئے
کتنے دکھڑوں کے صدا پیکر حروف
کتنے دردوں کے مسطّر زمزمے
پھر بھی کچھ ادراک میں آتا نہیں
کیا ہے رقصِ گردشِ ایام کیا

اک شکستہ ناؤ اک خونی بھنور
کیا ہے اس افسانے کا انجام کیا
یہ مفکر کچھ سمجھ سکتے نہیں

چھت کے نیچے روزنوں کے درمیاں
گول گول آنکھوں کے اندر محوِ دید

کالے پارے کی مرقّص پتلیاں
کاش یہ حیراں کبوتر جانتے
خفتہ ہے ان کاغذوں کی سطح پر
کتنے پھُنکتے آشیانوں کا دھواں
کتنے نخچیروں کی آہوں کے شرر
ہیں ان آوازوں کے اندر پرَ کشا
کتنے کرگس، جنکو مرداروں کی بو
کھینچ لائی ہے سرِ دیوارِ باغ

چھت کے نیچے، مضطرب نظارہ جُو
فکر مند آنکھوں میں حیراں پتلیاں
یہ کبوتر، دیکھتے تھکتے نہیں ——
دیکھتے ہیں سوچتے ہیں کیا کریں
یہ مفکر کچھ سمجھ سکتے نہیں

10 جنوری 1944

لاهور میں

ڈاک خانے کے ٹکٹ گھر پر خریداروں کی بھیڑ !
ایک چوبی طاقچے پر کچھ دواتیں —— اک قلم !
یہ قلم میں نے اُٹھایا اور خط لکھنے لگا ——
"پیارے ماموں جی !
"دعا کیجیے —— خدا —— رکھہ لے —— بھرم
"آج انٹرویو ہے ! —— کل تک فیصلہ ہو جائیگا
"دیکھیں کیا ہو ؟ مجھ کو ڈر ہے ——"
اتنے میں تم آگئیں !

"اک ذرا تکلیف فرما کر پتہ لکھ دیجیئے"

میں نے تم سے وہ لفافہ لے لیا ، جھجکا نہیں
بے دھڑک لکھ ڈالا میں نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ
مختصر ، رنگیں پتہ : "گلگت میں ۔ گوہر خاں کے نام"

"شکریہ" —— "جی کیا ؟" —— اک ہنستی نگہ زیرِنقاب
ڈاک میں خط —— ! ٹانگہ ٹمپل روڈ کو —— قصہ تمام

12 مارچ 1944

غزل

آ، سازِ گلستاں کو بہ مضرابِ خار چھیڑ
مطرب ، کوئی ترانہ بیادِ بہار چھیڑ

سوئے ہوئے سکوتِ چمن کو ذرا جگا
کچھ تو ، — نواطرازِ غم روز گار چھیڑ

کل یہ جگہ تھی وادئی نکہت ! رباب اٹھا
کل یاں ہجومِ گل تھا ! سرودِ بہار چھیڑ

قصہ کوئی بماتمِ جام وسبو سنا
نغمہ کوئی بہ تعزیتِ سبزہ زار چھیڑ

کچھ بھی نہ ہو ، خزاں تو ہے ، اک راگنی الاپ
ہر خس ہے ایک سازِ نوا در کنار چھیڑ

شاید پلٹ کے آ نہ سکے اب بہار ، گا
پژمردہ شاخسار پہ جھک کر ستار چھیڑ

روشن سی ہو چلی ہے وہ گذرے دنوں کی دھند
یہ داستاں پھر از سرِ نو ایک بار چھیڑ

27 نومبر 1944

ایک دعا

خلّاقِ دو جہاں! مری آنکھوں کو نور دے
چھینی ہوئی یہ دولت کیف و سرور دے

پھر قوتِ نظارۂ دشت و دیار بخش
پھر طاقتِ مشاہدۂ نزد و دور دے

مجھ پر نگاہِ مہر "سمیع" بصیر کر
مجھ کو نویدِ لطفِ خدائے غفور دے

اللہ! مجھ کو دیدۂ بینندہ کر عطا
مولا! تو ہی دوائے دلِ ناصبور دے

پھر سونپ میری آنکھوں کو آنکھوں کی روشنی
یہ میری چیز پھر مجھے دے اور ضرور دے

ہسپتال گوجرہ
22 دسمبر 1946

غزل

ضمیرِ راز داں ہے اور "میں ہوں"

جہاں اندر جہاں ہے اور "میں ہوں"

درِ پیرِ مغاں ہے اور "میں ہوں"

وہی رطلِ گراں ہے اور "میں ہوں"

وہی دورِ زماں ہے اور "میں ہوں"

وہی رسمِ فغاں ہے اور "میں ہوں"

فریبِ رنگ و بو ہے اور "تم ہو"

بہارِ صد خزاں ہے اور "میں ہوں"

جہاں ہے اور سکوتِ نیم شب ہے

مرا قلبِ تپاں ہے اور "میں ہوں"

یہ دو ساتھی نجانے کب بچھڑ جائیں

مری عمرِ رواں ہے اور "میں ہوں"

2 فروری 1950

غزل

کس کی گھات میں گم سم ہو ،
خوابوں کے شکاری !
جاگو بھی ،
اب آکاش سے پورب کا چرواہا ریوڑ ہانک چکا

میں جو تیری راگ سبھا میں
راس رچانے آیا تھا
دل کی چھنکتی جھانجھن تیری پازیبوں میں ٹانک چکا

بوجھل پردے !
بند جھروکا !
ہر سایہ —— رنگیں دھوکا !
میں اک مست ہوا کا جھونکا دوارے دوارے جھانک چکا

اجڑی یادوں کے شہرِ خاموشاں میں
کیا ڈھونڈتے ہو ؟
اب وہ زمانہ وقت کی میلی چادر میں منہ ڈھانک چکا !

کس کو خبر ،
اے شمع !
تری اس ڈولتی لو میں پروانہ
کتنے بگولے پھونک چکا اور کتنے الاؤ پھانک چکا

جولائی 1950

مشرق و مغرب

نہ خوابِ مشرق ،

نہ سحرِ مغرب ،

بس اک پھبکتی ، گداز مٹی کی چادرِ سبز ، جس کے دامن میں کل تھے انبانِ گندم‌وجو

اور آج انبارِ سیم و آہن

یہ کون سمجھے ،

یہ کون جانے ،

کہ اس تڑپتے ہوئے زمانے کی اوٹ میں ڈولتی سی شمعوں کی روشنی...جو

پیالۂ گلِ ، صراحئی سنگ ، کوزۂ مس کو پھاند کر ، شہر و دشتِ ساحل سے

اُٹھتے گرز و سنان و خنجر پہ جم گئی تھی ،

وہ کانپتی لو ، جو آج بھی طاقِ زندگی پر سسک رہی ہے ،

اُسی کا پرتو ، فروغِ منزل میں ڈھل گیا ہے ،

عجیب قصہ ہے ، ضربِ خارا سے ذہنِ فولاد جل اُٹھا ہے ،

نہ کوئی مشرق ،

نہ کوئی مغرب ،

مگر وہ اک زینۂ مراتب ،

جو ان گنت بے زباں غلاموں کی ٹوٹتی پسلیوں پہ کل بھی ہزار کف در دہاں

خداؤں کے بوجھ سے کچکچا رہا تھا ،

اور آج بھی اک وہی ترازو ، کہ جس میں زنجیر پوش روحوں کے شعلہ اندام

دست و بازو پہ مزدِ یک اشک تل رہے ہیں ،

اگر یہی تھا نصیبِ دوراں......... . ...یہ نالۂ غم ، یہ اک مسلسل خروشِ

آنبوہِ پابجولاں ،

ازل کی سرحد سے نسلِ آدم کی یہ کراہیں ، جو روزو شب کے عمیق سنّاہٹوں سے

پیہم ابھر رہی ہیں

یہ چشم و لب کے فسانہ ہائے سرشک و شیون ،

اگر مقّدر یہی تھا ، اپنا ، تو یہ مقدّر...... . یقین جانو.........اٹل نہیں تھا ،

یہی ہے مشرق ،

یہی ہے مغرب ،

وہ پارہ‌ہائے سفال و خارا ، وہ عقلِ حیراں کی کار گاہیں ،

وہ جنسِ نایاب ، کل ہمارے جہانِ صد ریزۂ خزف میں ہماری دولت تھی ،

ہم خدا تھے

اور آج بھی یہ شرار پیکر حقیقتوں کے طلسمِ سوزاں ،

یہ وسعتِ بحروبر میں غلطاں ، ضمیرِ آہن کی جلتی سانسیں

یہ ذرّے ذرّے کے قلبِ پیچاں میں کھولتی قوتوں کے طوفاں ، زمانہ ہے جن

کی رو میں تنکا ،

جو آج بھی ہو وجود اِن کا، ہماری مٹھی میں، ہم خدا ہیں ،

سیاہیوں کے چھلکتے خُم سے ابھرتی کرنوں کا حوصلہ ہیں ،

12 مارچ 1951

منزل

اس ایک بات سے انکار ہو نہیں سکتا ،

کہ ، ہم نے ، اپنے لہو سے بساطِ عالم پر ،

لکیر کھینچی ہے جس سلطنت کی ،

اُس کا وجود ،

ہے ایشیا کے شبستاں میں صبحِ نو کی نمود

یہ سب بجا ہے ، کہ ہم جن جگر کے ٹکڑوں کو ،

بہ شہر و قریہ ،

بہ دشت و چمن ،

بہ کوچہ و جام ،

بھڑکتی آگ میں ، بہتے لہو میں چھوڑ آئے

وہ روحیں جن کے سیہ پوش ماتمی سائے

ہمارے ہنستے ہوئے پیکروں سے لپٹے ہیں -

وہ قافلے کہ جنہیں مہلتِ سفر نہ ملی ،

انہی کے سڑتے ہوئے لوتھڑوں کی ہونکتی بُو ،

انہی کی ڈوبتی فریادیں چیختے آنسو ،

ہمارے محلوں کے نغمے ، ہمارے باغوں کے پھول !

مگر.........یہ پھول ، یہ نغمے ، یہ نکہتوں کے ہجوم

سحر سحر کو اگر مشکبار کر نہ سکے ،

نفس نفس کو امینِ بہار کر نہ سکے ،
وہ جن کے واسطے یہ گلستاں سجایا گیا
اسی طرح تہی داماں تہی سبد ہی رہے
تو... ...سوچ لو...... کہ یہ نازک لطیف ، پرتوِ نور

یہ لڑکھڑاتی ہواؤں میں ٹھہرا ٹھہرا غرور
ہزار ساعتِ بے برگ کے بیاباں میں
یہ اک اسنگوں بھری سانس ،
اس کا مستقبل ؟

ہماری زندگیوں سے اک اک تڑپ لے کر
پروئے ہیں جو فلک نے ، یہ سلکِ شام وسحر
گلوئے غم کے لئے
چہرۂ طرب کے لئے
سدا بہار ارادوں کے ہار...

ان کا مآل !

یہی سوال ہے رازِ غمِ زمان و زمیں
حضور اِس کا جبیں پر شکن ، جواب نہیں

17 نومبر 1951

ایک شام

ندی کے لرزتے ہوئے پانیوں پر،
تھرکتی ہوئی شوخ کرنوں نے چنگاریاں گھول دی ہیں
تھکی دھوپ نے آ کے لہروں کی پھیلی ہوئی ننگی باہوں پر اپنی لٹیں کھول دی ہیں!
یہ جوئے رواں ہے
کہ بہتے ہوئے پھول ہیں، جن کی خوشبوئیں گیتوں کی سسکاریاں ہیں
یہ پگھلے ہوئے زرد تانبے کی چادر پہ اُلجھی ہوئی سلوٹیں ہیں
کہ زنجیر ہائے رواں ہیں!

بس اک شورِ طوفاں!
کنارا نہ ساحل۔!
نگاہوں کی حد تک
سلاسل! سلاسل!
کہ جن کو اٹھائے ہوئے ڈولتی پنکھڑیوں کے سفینے بہے جا رہے ہیں
بہے جا رہے ہیں
کہیں دور ان گھور اندھیروں میں جو فاصلوں کی ردائیں لپیٹے کھڑے ہیں
جہاں پر اَبَد کا کنارا ہے......اور اک وہ گاؤں
وہ گنّے کے کیاروں پر آتی ہوئی ڈاک گاڑی کے بھورے دھوئیں کی چھچھلتی سی چھاؤں!

دسمبر 1951

دھوپ چھاؤں

ناچتی ندیاں ،

جھومتے جھامتے پیڑ ،

اجیالی دھوپ

ان سے بھی آگے ، دور کہیں وہ دنیا

جس کا روپ

آنے والے مست دنوں کے ہونٹوں پر مسکان !

سمے سمے کا دھیان

پھیکی پھیکی چاندنیاں

اور کجلی کجلی دھوپ ——

جن کی اڑتی راکھ میں جھلکے بیتے دنوں کا روپ

سناٹوں کی گھمر گھمر میں ڈوبتا ڈوبتا گیت

سمے سمے کی ریت

من کی یہ چنچل لہریں ، اِن کا کوئی نہ ٹھور مقام

دن گزرے تو صبح سویرا ، رات کٹے تو شام

ساون ساون جلتے جھونکے

پلک پلک برسات

سمے سمے کی بات

دسمبر 1951

اکھیاں کیوں مسکائیں

کون بتائے رُوپ نگر کی سکھیاں اکھیاں کیوں مسکائیں
دل کے راگ محل کی تانیں
سندیسوں کے دیس سے ہو کے
پائل کی جھنکار کو روکے
جب ہونٹوں کے دروازوں پر ، چھپ چھپ آئیں ، رک رک جائیں
اکھیاں کیوں مسکائیں

پھاند کے سنّاٹوں کے جزیرے
مہر بلب سانسوں کے بیاباں
آن بسیں جب رقصاں رقصاں
اک لمحے کے رین بسیرے میں ارمانوں کی پرچھائیں
اکھیاں کیوں مسکائیں

گھونگھٹ کھولے ، نہ منہ سے بولے
من کی بانی ، چنچل رانی
جب یہ کہانی،
دور ، انجانی
دنیاؤں سے گزرے بن کر دھیمی بانسریوں کی صدائیں
اکھیاں کیوں مسکائیں

8 دسمبر 1952

ایک خیال

تمہارے ہونٹ وہ گھلتے سے ریزہ ہائے نبات
مرے لبوں سے ملے ، جھکتی جھکتی پلکوں کے سات
تو جھونکے جھونکے میں لہرا گئی شمیمِ حیات ،

کسے خبر ، کے پھسلتا ہوا وہ جسمِ حسیں ،
مری بھنچی ہوئی باہوں کی دولتِ رنگیں
اب اس کی خاک بھی خاکِ لحد میں ہے کہ نہیں

تمہاری گردِ کفن اور ہجومِ کرمکِ گور
مصاحبانِ اجل ، گنگ و پابریدہ و کور
بس ایک میری نوا میں تمہاری روح کا شور!

میں زندہ ہوں تو مری زندگی تمہاری حیات
وگرنہ یوں تو ہے کس کو دوام ، کس کو ثبات
نفس نفس ، سرِ ظلمات ، پرتوِ ظلمات

6 جون 1953

نرگس

میں نے حسرت بھری نظروں سے تجھے دیکھا ہے
جب تو روز اک نئے بہروپ میں ، روز اک نئے انداز کے سات
اپنی ان گاتی ہوئی انکھڑیوں کی چشمکِ طناز کے سات
روز اک تازہ صنم خانۂ آہنگ میں در آئی ہے ،

ایکٹریس ، روپ کی رانی ، تجھے معلوم نہیں ،
کس طرح تیرے خیالوں کے بھنور میں جی کر ،
کن تمناؤں کا تلخابۂ نوشیں پی کر ،
میں نے اک عمر ترے ناچتے سایوں کی پرستش کی ہے ،

تو نے اک عظمتِ صد رنگ سے جس جذبے کو ،
آج تک اپنے لئے سنودِ ہزار اشک سمجھ رکھا ہے
وہ محبت مرے سینے میں تڑپتی ہوئی اک دنیا ہے ،
جو ترے سائے کی ہر چاپ پہ چونک اُٹھتی ہے۔

کاش میں بھی وہی اک عکسِ درخشاں ہوتا ،
دلِ انساں سے اُبھرتی ہوئی موہوم تمناؤں کا عکس ،
ایک مانگی ہوئی اچکن میں سمایا ہوا ماسورِ فغاں شخص ،
جس کے پہلو میں تری روح دھڑک سکتی ہے !

1954

نہ کوئی سلطنتِ غم نہ اقلیمِ طرب

کیا کہوں ، کتنے غموں ، کتنے غموں کی شکن آلود بساط
وقت کے گھومتے زینوں پہ مرے رکتے ہوئے قدموں کے سات
کس طرح بچھتی ، لپٹتی ہی چلی آئی ہے
کیا بتاؤں یہ کہانی بڑی طولانی ہے

یہ مرا قصۂ غم کون سنے ؟ کس کو سناؤں ـــــــــ کس کو
اپنے احساس کا وہ جلتا ہوا زہر پلاؤں ؟ ـــــــــ جس کو
پیتے پیتے مری اک عمر کٹی ہے اک عمر ،

دیکھتے ہو وہ جو اک جادۂ نورانی ہے ،
وہ جو اک موڑ ہے اور وہ جو جھروکا ہے سرِبامِ بلند
کبھی پہنچی نہیں جس تک سحر و شام کے سایوں کی کمند
وہ جو جھکتی ہوئی مڑتی ہوئی دیواریں ہیں،
جن کا منصب انہی گلیوں کی نگہبانی ہے
وہ جو ہر شام انہی گلیوں میں کوئی مست سی لے
بند ہوتے ہوئے دروازوں کے آہنگ میں گھل جاتی ہے ۔

وہ خموشی ، سفرِ شب کے تسلسل کی نقیب ،
جس کی میت پہ اندھیروں نے ردا تانی ہے ۔

میں نے اک عمر اسی معمورۂ ظلمات میں رقصاں ، جولاں
ہر قدم اپنے ہی قدموں کی صداؤں سے گریزاں ، لرزاں
جگرِ جام سے چھینے ہوئے نشوں میں مگن
خاک ان راہوں کی یوں خاک بہ سر چھانی ہے
جس طرح ایک سہارے کی تمنا میں کسی ٹوٹتے تارے کی حیات
مہ و انجم کے سفینوں کی طرف اپنے بڑھائے ہوئے ہات
خمِ افلاک سے ٹکرا کے بھسم ہوجائے
(ان خلاؤں میں کسے تابِ پرافشانی ہے !)

میں بھی پلکوں پہ امنگوں کے دیئے لے کے گرجتے ہوئے طوفانوں میں
منتظر تھا ، کہ اچانک کہیں باغوں میں ، بیابانوں میں
آ کے بس جائے کسی نغمۂ شیریں کی بہار!
یہ مرے گرد جو پھیلی ہوئی ویرانی ہے ،
کب یہاں ریزۂ صد ساغرِ بشکستہ سے کلیاں پھوٹیں

میں نہیں کہتا کہ کلیاں نہیں مہکیں مرے گلزاروں میں ،
مجھ کو یہ غم ہے وہ اک لمحۂ نایاب کہ جو
حاصلِ سلطنتِ عالمِ امکانی ہے ،
جب مری زیست سے ٹکرا کے بھسم ہو بھی گیا تب مجھے معلوم ہوا ،
تب میں سمجھا ، کہ یہ راہیں ، یہ گھروندے ، یہ پھبکتی دنیا ،

اب یہ سب کچھ غمِ جاوید کی اک دھڑکن ہے۔
اب یہی زخم ہیں اور شغلِ مگس رانی ہے!

آج بھی جب کہیں رستے میں، کسی موڑ، کسی منزل پر
کسی دیوار سے کنکر بھی پھسل جاتا ہے،
کوئی دامن کہ جسے نازِ گل افشانی ہے،
دھوپ میں سوکھتی خرما کی چنگیروں سے بھرے کوٹھوں سے
اک پل کے لئے اُڑتا ہے، سمٹتا ہے تو دھیرے دھیرے ——
کوئی لے سی مرے احساس میں بھر جاتی ہے،
تارِ بربط کی کوئی لرزشِ پنہانی ہے،
جو شب و روز کے ایوان میں فغاں بن کے بکھر جاتی ہے،
آسمانوں سے زمینوں سے کسی دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے،
کوئی چپکے سے مرے کان میں کہہ جاتا ہے،
سنتے ہو، کس کی یہ آواز ہے، پہچانی ہے:
"یوں کب تک صبح و شام جلیں،
بے سود جلیں، ناکام جلیں،
جب دنیا والے سو جائیں،
بیٹھے سپنوں میں کھو جائیں،
جب چلتے دریا تھم جائیں،
تاروں کی نگاہیں جم جائیں،
جب آگ بجھے چوپالوں کی،

جب آنکھ لگے رکھوالوں کی ،
دیوار و در سے چمٹتے ہوئے ۔
سائے کی طرح سمٹتے ہوئے ،
دو بھک منگوں کے بھیس میں ہم،
جانکلیں اک اور دیس میں ہم ،
کچھ دور ، افق کے پار ، ادھر
ہے ایک نیا سنسار ، اُدھر
خوشیوں کی سنگاروں کی دنیا
پھولوں کی بہاروں کی دنیا "

آج اس فرصتِ یک گام کو روتا ہوں جب اک لغزشِ پا
چھین کر لے گئی ، مجھ سے وہ امنگوں سے چھلکتی دنیا
آہ وہ دنیا جسے کھو کے میں پھر پا نہ سکا ،
یوں تو آفاق میں دنیاؤں کی ارزانی ہے ،
ان خلاؤں میں ستارے بھی ہیں خورشید بھی ہے ، ماہ بھی ہے
کون جانے کہ زمانے کے سمندر کی کوئی تھاہ بھی ہے -
لیکن اک دنیا جسے کھو کے میں پھر پا نہ سکا
جس کے ماتم میں مری چاک گریبانی ہے -
مری سم خوردہ تمناؤں کی نظروں سے گریزاں ہی رہی -
لاکھ ڈھونڈھا ، مگر افسوس کہ اک رنجِ پشیماں نگہی
بوجھ بن کر مری تقدیر کی پلکوں پہ رہا ،

اب مرا دل ہے کہ اک عالمِ حیرانی ہے -

اب یہ دنیا ، یہ صدا گوش نصیبوں سے بھرے شہر و دیار
غموں خوشیوں کے جھمیلوں میں نہاتی ہوئی روحوں کا نکھار
مجھ سے پوچھو تو مرے سامنے اب یہ دنیا
ورقِ مصحفِ اندوہِ گراں جانی ہے -

سوچتا ہوں یہی دو گھونٹ جو میں نے خمِ دوراں سے پئے ،
یہی دو سانس ، شبستانِ ابد میں یہی دو بجھتے دیئے ،
دوش و فردا کی فصیلوں میں یہی دو رخنے ،
یہی جو سلسلۂ زندگیٔ فانی ہے -
کیا اسی ساعتِ محرومئی غم تاب کی خاطر میں نے
وسعتِ وادئی ایام میں کانٹوں کے قدم چومے تھے ؟
لاکھوں دنیاؤں کے لٹتے ہوئے کھلیانوں سے ،
میرا حصہ یہی میری تہی دامانی ہے ؟
کیا اسی واسطے ماضی کے کہستانوں سے اک موجِ حیات
اپنے همراہ لئے ناچتی گاتی ہوئی صدیوں کی برات
آکے اس ساحلِ گل پوش سے ٹکرائی ہے ؟
کیا یہی مقصدِ صد عالمِ امکانی ہے !
کہ جب اس سطحِ فروشندہ پہ ڈھونڈوں میں کوئی رختِ طرب
کوئی مکھ ، کوئی نگہ ، کوئی تبسم ، کوئی جینے کا سبب
آسمانوں سے صدا آئے "تو کیا ڈھونڈتا ہے ،

تیرا ساماں تو یہی بے سروسامانی ہے"

عقل حیران ہے، یہ طرفہ حجاباتِ حریمِ اسرار
عقدۂ راحت و غم، رازِ جہانِ گل و خار
پابہ زنجیر ارادوں کا خروشِ پیہم،
یہی مستقبلِ معمورۂ انسانی ہے؟
کس کی فتراک میں ہیں عرش بریں فرش نشیں؟ کون کہے
پسِ صد پردۂ افلاک کوئی ہے کہ نہیں؟ کون کہے
جانے کن گہرے دھندلکوں سے ضیا پاتی ہے،
در حقیقت یہ حقیقت کی جو تابانی ہے
اتنے زخموں سے سجا کر دلِ بے تاب کی پژمردہ جبیں،
کس نے بھیجا ہمیں اس جلتے ہوئے دیس میں؟ معلوم نہیں
یوں نہ اپنے دمِ امید کو بہلائے کوئی
کون کہتا ہے گلستاں میں بہار آئی ہے!

جی میں آتی ہے کہ اک بار غمِ زیست پہ احساں دھر کر
ریگِ گردوں میں ابلتے ہوئے زہراب سے خم بھر کر
——— ریگِ گردوں کے ابد رنگ شکم میں جس کے
کھولتے دردوں کا ہنگامۂ لافانی ہے ———
اسی زہراب سے خم بھر کے پٹخ دوں افقِ دوراں پر،
آگ آہی آگ برسنے لگے اس پھولوں بھرے بستاں پر

اب یہی دھن ہے کہ اس ظلمتِ بے پایاں کو
جو مری روح کے ایوان کی زندانی ہے
اٹھ کے پھیلاؤں انہی اونچے درختوں سے ڈھکی راہوں پر
انہی گدرائی ہوئی دھوپ میں لہراتی چراگاہوں پر ،

اب ارادہ ہے کہ ان بِس بھرے ارمانوں کو
جن کے سایوں میں مری زیست کی ویرانی ہے
گھول دوں جھومتے جھونکوں کے چھلکتے ہوئے پیمانوں میں
سینۂ دشت پہ بجتی ہوئی شہنائیوں کی تانوں میں

چاہتا ہوں کہ یہ زیتون کے جنگل کا سکوت
جس کی وسعت ہے کہ اک عالمِ حیرانی ہے ،
میری کھوئی ہوئی دنیاؤں کے کہرام سے تھرا اُٹھے

اب یہ ٹھانی ہے کہ جمتی ہوئی بوندوں کے یہ بیکل چھینٹے ،
تیز جھالوں کے یہ چابک سے کہ جنکی زد پر ،
کڑے رستوں کی تھکی پیٹھ کی عریانی ہے

یہ دھواں دھوپ ترائی ، یہ دھواں دھار پہاڑوں کی فصیل

دور تک چوٹیوں اور بدلیوں کے دیس کی سرحدِ جمیل

برف سی بدلیاں ، جن کے لبِ تر سے پیوست
برف کی چوٹیوں کی دودھیا پیشانی ہے ،

ہاں یہ سب سلسلۂ رنگ ، یہ گہوارۂ حسن وافسوں
میں اسے اپنی دکھی روح کی ان راگنیوں سے بھر دوں
جن کی لہریں کبھی آنسو ہیں ، کبھی آہیں ہیں
جن کی تقدیر کبھی آگ کبھی پانی ہے

کوئی غایت ، کوئی منزل ، کوئی حاصل سفرِ ہستی کا
کوئی مقصود بلندی کا کہ مفہوم کوئی پستی کا
کوئی مشعل بھی نہیں کوئی کرن بھی تو نہیں ،
شب اندھیری ہے ، گھٹا ٹوپ ہے ، طوفانی ہے ،
بولو اے نغمہ سرایانِ تحیّر کدۂ کاہکشاں
میں کہاں جاؤں ، کہاں جاؤں ، کہاں جاؤں ، کہاں ؟

نغمۂ کواکب

دائیموس

ناچ ناچ جھوم جھوم

گھوم گھوم گھوم گھوم

دیکھنا ادھر ضرور اک نظر
ناچتا ہے نزد و دور بے خبر
دامنِ نگارِ نور تھام کر

کہکشاں کے موڑ پر فاصلوں کا اک ہجوم
ناچ ناچ گھوم گھوم

وسعتِ ابد پناہ اک ترنگ
عالمِ شبِ سیاہ اک امنگ
منزلیں نشانِ راہ سحر رنگ

شعلہ شعلہ رنگ رنگ آگ آگ روم روم
گھوم گھوم گھوم گھوم

فینبوس

دئے جلتے رہے ، دئے جلتے رہے

گُھم گُھم اُمڈے دھوئیں کے بادل

جگ جگ پھیل گئے کاجل
دم دم ، دھم دھم گرے محل
سٹی ہوئی صدیوں میں پل

ڈھلتے رہے
دیئے جلتے رہے !

کتنے زمانے ، کتنے سپن
توڑ گئے اپنے درپن
نیر بہاتے رہے نین
وقت کے جھکڑ گگن گگن

چلتے رہے
دیئے جلتے رہے !

اندھیاروں کے زہر پئے ،
آنکھوں کو گل رنگ سیئے
امر اجالے لو میں لیئے
جیون کی منڈلی میں دیئے

جلتے رہے
دیئے، جلتے رہے ،

بھنور بھنور مری نو کا ،

کوئی ساحل ہے نہ کنارا
اک پھیلتا بڑھتا دھارا
بہے نگر نگر——————مری نَو کا ، بھنور بھنور

ہر آن رتوں کا میلہ
ہر سمت سمے کا ریلہ
چلے گھمر گھمر——————مری نَو کا ، بھنو بھنور

بوجھ اتنے ہیں کڑیل جن کے
یہ دکھ سکھ بہتے تنکے
گریں ابھر ابھر——————مری نَو کا ، بھنور بھنور

کبھی ہوئی من کی رانی
تقدیر جہاں کی رانی
پھرے سنور سنور——————مری نَو کا ، بھنور بھنور

پلوطو

کتنی اندھیری رات ہے ، چمکو چمکو

شام و سحر کی اوٹ سے ہر دم ،

پیہم ،

گھور رہے ہیں طوفاں ہم کو، چمکو

دیکھو تیرگیوں کے فتنے ،

کتنے ،

روند چلے عالم عالم کو، چمکو،

سکھ میں سمو لو اک پل کو،

مجھکو ،

من میں بجھالو شعلۂ غم کو، چمکو

آتے ہوئے کرنوں کا تبسّم ،

ہم تم ،

جگ مگ دمکو، جھم جھم چمکو، چمکو

کتنی اندھیری رات ہے چمکو، چمکو ،

کرہ ارض

نہ عکسِ خاک کہیں اور نہ رقصِ نور کہیں
نہ کوئی وادئی ایمن نہ شمعِ طور کہیں
بجھی ہے راکھ میں غلطاں مئے طہور کہیں
پڑا ہے شیشئہ افلاک چُور چُور کہیں
پلوں کے جھنڈ میں لرزے ابد کی پینگ کوئی،
نظر کے سامنے حدِّ نظر سے دور کہیں،
مقّدروں کے جہاں در جہاں اندھیروں میں
بھٹک نہ جائے مرا شوقِ ناصبور کہیں
یہ اضطرابِ مسلسل کی خوں چکاں گھڑیاں
ہے ان سے بڑھ کے کوئی دولتِ سرور کہیں
اگر ہمیں بھری دنیا میں مسکرا نہ سکے
تو ڈول جائیں گے یہ سلسے ضرور کہیں

شہر در شہر منادی ہے کہ
اے خندہ فروشانِ حیات
ہر بجھی روح کے آنگن میں کھلا ہے چمنِ امکانات
نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیمِ طرب
زندگی ہی فقط آئینِ جہاں بانی ہے۔

جانے کس تیرہ اُفق سے یہ گھٹاؤں کے تھرکتے سائے
ماہتابوں کے چمکتے ہوئے سینوں سے نتھر کر آئے
ساتھ لے کر وہ خُنک موج ، خُماریں جھونکے
جن کی زد میں مری تپتی ہوئی پیشانی ہے

اپنے سینے میں جگا کر انہی دوروں ، انہی یادوں کے فُسوں ،
پھر تمّناؤں کے تصویر کدے میں نگراں بیٹھا ہوں
سامنے صفحۂ صد رنگ رموزِ کونین
کانپتی انگلیوں میں مو قلمِ مانی ہے

20 اکتوبر 1954

کہانی ایک ملک کی..........................

راج محل کے دروازے پر ،
آکے رکی ، اک کار ——————
پہلے نکلا ——لمبا—— پتلا ——بودا——
میل کچیل کا تودہ ،
حقہ تھامے اک میراسی ،
عمر اُس کی ، کوئی اسی بیاسی ،
پیچھے اس کا نائب ، حُقہ برادر
باہر رینگے ، اس کے بعد ، قطار ، قطار ،
عنبر بار ،
نمبردار ،
ساتھ سب ان کے دم چھلّے ،
ایم ائے ——————!

راج محل کے اندر ، اک اک رتناسی پر ،
کوڑھی جسم اور نوری جامے ،
روگی ذہن اور گردوں پیچ عمامے ،
جہل بھرے علامے ،
ماجھے ، گامے ،
بیٹھے ہیں ، اپنی مٹھی میں تھامے
ہم مظلوموں کی تقدیروں کے ہنگامے ،

جیبھ پہ شہد اور جیب میں چاقو ،
نسلِ ہلاکو

راج محل کے باہر ، گہری سوچ میں ڈوبے ،
شہر اور گاؤں
ہل کی انی ، فولاد کے پنجے ،
گھومتے پہیّے ، کڑیل باہیں
کتنے لوگ کہ جن کی روحوں کو سندیسے بھیجیں ،
سکھ کی سیجیں ،
لیکن———جو ہر راحت کو ٹھکرائیں ،
آگ پئیں اور پھول کھلائیں

1956-57

غزل

دل کٹ رہے ہیں کشمکشِ روزگار میں
دم گھٹ رہا ہے سایۂ ابرِ بہار میں

آتی ہے اپنے جسم کے جلنے کی بُو مجھے
لُٹتے ہیں نکہتوں کے سبو جب بہار میں

گزرا اِدھر سے جب کوئی جھونکا تو چونک کر
دل نے کہا : یہ آ گئے ہم، کس دیار میں

اے کنجِ عافیت، تجھے پا کر پتہ چلا
کیا ہمہمے تھے گردِ سرِ رہگزار میں

میں ایک پل کے رنجِ فراواں میں کھو گیا
مرجھا گئے زمانے مرے انتظار میں

6 جون 1955

غزل

اک وہ کہ جن کی فکر ہے ارض و سما شکار
اک تو کہ ہے طلسمِ شب و روز کا شکار
لاؤ کہیں سے کوئی ضمیرِ فرشتہ صید،
ڈھونڈو کہیں سے کوئی نگاہِ خدا شکار
اس انجمن میں دیکھئیے اہلِ وفا کے ظرف
کوئی ادا شناس ہے کوئی ادا شکار،
آتا ہے خود ہی چوٹ پہ صیدِ سبک مراد
ہوتا ہے ورنہ کون زکارِ قضا شکار
ظلِّ ہما کی اوٹ میں چلّے پہ تیر رکھ
آساں نہیں نگاہ کے نخچیر کا شکار،
جولاں گہِ حیات انہی کی ہے، دوستو،
فتراک میں ہے جن کے دلِ مدّعا شکار،

24 اگست 1956

غزل

چاندنی میں سایہ ہائے کاخ و کو میں گھومیے
پھر کسی کو چاہنے کی آرزو میں گھومیے،

شاید اک بھولی تمنّا، مٹتے مٹتے جی اٹھے
اور ابھی اس جلوہ زارِ رنگ و بو میں گھومیے

روح کے دربستہ سنّاٹوں کو لے کر اپنے ساتھ
ہمہماتی محفلوں کی ہاؤ ہو میں گھومیے

کیا خبر، کس موڑ پر مہجور یادیں آملیں
گھومتی راہوں پہ، گردِ آرزو میں گھومیے

زندگی کی راحتیں ملتی نہیں، ملتی نہیں
زندگی کا زہر پی کر جستجو میں گھومیے

کنجِ دوراں کو نئے اک زاویے سے دیکھیے
جن خلاؤں میں نرالے چاند گھومیں گھومیے

1956—57

غزل

نہیں سنتا کوئی مجھ کشتۂ آلام کے شکوے،
کئے میں نے ہر اک ایواں کی چوکھٹ تھام کے شکوے،

شفق کے رنگ آنکھوں میں، سحر کی اوس پلکوں پر،
نہ آئے پھر بھی لب پر چرخِ نیلی فام کے شکوے،

یہ کیسا دور ہے جس میں مجھے سننے پڑے ساقی
وبالِ ہوش کے طعنے، شکستِ جام کے شکوے

اب ان بھولے ہوئے قصّوں کو دہرانے سے کیا حاصل
یہ اب کیا آپ لے بیٹھے دلِ ناکام کے شکوے

تماشا ہے کہ جن کے واسطے گردش میں تھے عالم
انہیں بھی سوجھتے ہیں گردشِ ایام کے شکوے

1956

غزل

امیدِ دیدِ دوست کی دنیا بسا کے ہم،
بیٹھے ہیں مہرو ماہ کی شمعیں بجھا کے ہم،

وہ راستے خبر نہیں، کس سمت کھوگئے
نکلے تھے جن پہ رختِ غمِ دل اُٹھا کے ہم،

پلکوں سے جن کو جلتے زمانوں نے چن لیا
وہ پھول، اس روش پہ ترے نقشِ پا کے ہم

آئے کبھی اک ایسی بھی صبحِ طرب کہ جب
روٹھے ہوئے غموں سے ملیں مسکرا کے ہم

کس کو خبر کہ ڈوبتے لمحوں سے کس طرح
ابھرے ہیں یادِ یار، تری چوٹ کھا کے ہم

1956

موجودگی

پھر آج دل میں کوئی سوج غم مچلتی ہے ،
شبِ خیال میں قندیلِ عُود جلتی ہے ،
پھر اک ادائے حجاب
رسومِ دہر کی زنجیر اتار آئی ہے
بہار آئی ہے ——— !

رسومِ دہر کی اس آتشیں فصیل کے پار ،
گداز سینوں کی مخمور دھڑکنوں کے دیار ،
محبّوں کے سراب ،
کہ جن کو تیر کے آتی ہے پائلوں کی چھنک
مرے دُکھی دل تک ——— !

ہر اک طرف ، ہوسِ دید کے نیستاں میں
کسی حسین سی موجودگی کی خوشبوئیں
خمارِ قُرب کے خواب ،
ہزار غم کہ جنہیں کیفِ شوق کی نیندیں
پیامِ تسکیں دیں !

16 مارچ 1957

بھکارن

تیز قدموں کی آہٹوں سے بھری

رہگزر کے دو رویہ ، سبزہ و کشت

چار سو ہنستی رنگتوں کے بہشت

صد خیابانِ گل — کہ جن کی طرف

دیکھتا بھی نہیں کوئی راہی !

سرخ پھولوں سے اک لدی ٹہنی ،

آن کر بچھ گئی ہے رستے پر ،

کنکروں پر جبیں رگڑتی ہے

راہگیروں کے پاؤں پڑتی ہے :

" میں کہاں روز روز آتی ہوں ،

ہے مرے کوچ کی گھڑی نزدیک

جانے والو، بس اک نگاہ کی بھیک"

28 مارچ 1957

دیکھ اے دل

دیکھ اے دل ، کیا سماں ہے ، کیا بہاریں شام ہے
وقت کی جھولی میں جتنے پھول ہیں انمول ہیں
نہر کی پٹڑی کے دو رویہ ، مسلسل ، دُور ، تک
برگدوں پر پنچھیوں کے غل مچاتے غول ہیں

دیکھ اے دل ، کتنے ارمانوں کا رس برسا گئیں
بدلیاں ، جب ان پہ چھینٹے نور کے چھن کر پڑے
کتنی کوسل کامناؤں کی کہانی کہہ گئے
پیپلوں کے پیلے پیلے پات پتھ پتھ پر پڑے

دیکھ اے دل اس رسیلی رت کے کتنے روپ ہیں
جھوستے جھونکے ہیں ، جھکتی جھاڑیوں کے جھنڈ ہیں
ہائے ان پھیلی ہوئی پھلواڑیوں کے درمیاں
اِک تری تپتی ہوئی تنہائیاں اور ایک میں

اپریل 1957

غزل

جھونکوں میں رس گھولے دل ،
پون چلے اور ڈولے دل

جیون کی رت کے سو روپ
نغمے ، پھول، جھکولے، دل

تاروں کی جب جوت جگے
اپنے خزانے کھولے ، دل

یادوں کی جب پینگ چڑھے
بول البیلے ، بولے ، دل

کس کی دھن ہے ، باورے من
تیرا کون ہے ؟ بھولے ، دل

25 جولائی 1957

غزل

وہ شے جو ایک نئے دور کی بشارت ہے
ترے لہو کی تڑپتی ہوئی حرارت ہے

نظامِ کہنہ کے سائے میں عافیت سے نہ بیٹھ
نظامِ کہنہ تو گرتی ہوئی عمارت ہے

وطن چمکتے ہوئے کنکروں کا نام نہیں
یہ تیرے جسم تری روح سے عبارت ہے

یہ کہہ رہی ہے صدا ٹوٹتے سلاسل کی
کہ زندگی تو فقط اک حسیں جسارت ہے

یہ اک جھلک ہے بدلتے ہوئے زمانوں کی،
جبیں جبیں پہ شکن بھی کوئی بجھارت ہے

چمن میں اہلِ چمن کے یہ طور، ارے توبہ
کلی کلی کی ہنسی خندۂ حقارت ہے

دلوں کی جھونپڑیوں میں بھی روشنی اترے
جو یوں نہیں تو یہ سب سیلِ نور اکارت ہے

دسمبر 1957

غزل

قریبِ دل، خروشِ صد جہاں ہم
جو تم سن لو تمہاری داستاں ہم

کسی کو چاہنے کی چاہ میں گم،
جئے بن کر نگاہِ تشنگاں، ہم

ہر اک ٹھوکر کی زد میں لاکھ منزل
ہمیں ڈھونڈو، نصیبِ گمرہاں، ہم

ہمیں سمجھو، نگاہِ ناز والو!،
لبوں پر کانپتا حرفِ بیاں، ہم

بجھی سمتوں کی اس نگری میں امجد
ابھرتے آفتابوں کی کماں، ہم

یکم اپریل 1958

غزل

قاصدِ سست گام ، موجِ صبا ،
کوئی رمزِ خرام ، موجِ صبا ،

وادیٔ برف کا کوئی سندیس ،
میرے اشکوں کے نام موجِ صبا ،

کوئی موجِ خیال میں بہتی
منزلوں کا پیام ، موجِ صبا ،

سوسمٹتی مسافتوں کا طلسم !
تیری کروٹ کا نام ، موجِ صبا ،

تیرے دامن کی خوشبوؤں میں ہیں گم
سو سہانے مقام ، موجِ صبا ،

آتی پت جھڑ کے ساتھ لوٹتے وقت
اک بہاریں پیام ، موجِ صبا ،

اک نویدِ نگاہ ، پیکِ حبیب ،
اک جوابِ سلام ، موجِ صبا ،

1958

پکار

کالی چونچ اور نیلے پیلے پنکھوں والی
چوں چوں ، چچر چچر ، چچلائی "لالی"
بیٹھے بیٹھے ، اُڑ کر
اُڑتے اُڑتے ، مڑ کر
بجلی کے اک تار پہ آ کر بیٹھ گئی ہے
موت کا جھولا جھول رہی ہے !

میرے دل سے چیخ اک اُبھری، میں للکارا
(جیسے کوئی بجے نقارا)
میری صدا پر بامِ اجل سے کندے تول کے اُڑ گئی "لالی" !
پیلے پیلے پنکھوں والی !

اور اک تم ہو
انگاروں پر بیٹھے ہو اور پھولوں کے سپنوں میں گم ہو
میرے دل کی اک اک چیخ تمہیں بے سود پکارے

اگست 1958

جیون دیس

پیلے چہرے ، ڈوبتے سورج—روحیں ، گہری شامیں ،
زندگیوں کے صحن میں کُھلتے قبروں کے دروازے ،
سانس کی آخری سلوٹ کو پہچاننے والے گیانی ،
ڈولتی محرابوں کے نیچے آس بھرے اندیشے ،
بوڑھی کبڑی دیواروں کے پاؤں چاٹتی گلیاں ،
ٹوٹتے فرش ، اکھڑتی اینٹیں گُزرتے دنوں کے ملبے ،
دکھے دلوں کے سجدے چنتی پلکیں ، بچھڑے پریمی
بجھے جھروکوں سے ٹکراتی یادیں ، ڈھلتے سائے
بجتی ڈھولک ، گاتی سیّاں ،……نیر بہاتی خوشیاں
جاگتے ساتھی ، سوچتے نیناں ، آنے والے زمانے ،
خونی بازاروں میں بکتی ، اک اک میلی چوڑی ،
پنکھیاں جھلتی ننگی باہیں ، نیند آنند پنگھوڑے ،
کنٹھا پہنے اک متوالا بالا ، ریڑی والا
موڑ موڑ پہ جیون رت کی زخمی کلیاں بانٹے
جینے کے یہ سارے جتن ، انمول سمے کی مایا
سدا رہیں ان سدا بہار دکھوں کے روپ سہانے
تو بھی رک کر اس بھنڈار سے اپنی جھولی بھرے
تیری تڑپ کا انت یہی ہے ، اے دل اے دیوانے

1958

غزل

کیا کہئے کیا حجابِ حیا کا فسانہ تھا
سب کچھ بس اک نگاہِ کرم کا بہانہ تھا
دیکھا تو ہر تبسّم لب والہانہ تھا
پرکھا تو ایک حیلۂ صنعت گرانہ تھا
دنیا، امیدِ دید کی دنیا تھی دیدنی
دیوار و در اداس تھے، موسم سہانا تھا
ہائے وہ ایک شام کہ جب مست نے بہ لب
میں جگنوؤں کے دیس میں تنہا روانہ تھا
یہ کون ادھر سے گزرا، میں سمجھا حضور تھے
اک موڑ—اور مڑ کے جو دیکھا زمانہ تھا!
اک چہرہ اُس پہ لاکھ سخن تاب رنگتیں
اے جرأتِ نگہ، تری قسمت میں کیا نہ تھا
ان آنسوؤں کی رو میں نہ تھی موتیوں کھیپ
ناداں، سمندروں کی تہوں میں خزانہ تھا
اے غم، انیسِ دل، یہ تری دلنوازیاں
ہم کو تری خوشی کے لئے مسکرانا تھا
اک طرفہ کیفیت، نہ توجہ نہ بے رُخی
میرے جنونِ دید کو یوں آزمانا تھا!
ہائے وہ دھڑکنوں سے بھری ساعتیں مجید
میں اُن کو دیکھتا تھا، کوئی دیکھتا نہ تھا

1958

دو چیزیں

آنسو کیا ہے ؟ قطرۂ آب ،——ذی جسم اور سیّال
غم کیا شے ہے ؟ دل کی آگ——جلتا جلتا کوئی خیال

کا ہے کو ہم کریں تمہارا دل مجروح
مان لی ہم نے بات تمہاری
ایک چیز ہے جسم ،
ایک چیز ہے روح ،

جھانکو اپنی روح کے اندر——ہے کوئی ایسا تٹ
جہاں خلا کے خول میں ڈولیں—جسموں کے جھمگھٹ ،
ڈھونڈو اپنے جسم کے اندر——ہے کوئی ایسی نخ ،
جہاں دھوئیں کے دھند میں کھولیں—روحوں کے دوزخ ،

یہ سب سچ ہے ، لیکن رکھیو——ایک اس بات کا دھیان
کس طرح من کی ہر کروٹ کو——شکن دیتے ہیں پران
سوچو ، کس طرح دل سے اٹھ کر——ایک خیال کی لہر
دیکھتے دیکھتے بن جاتی ہے——صد ہنگامۂ دہر !

سچ پوچھو تو جیون اپنا——ایک عجیب طلسم ،
گتھ مٹھ ، وس بس ، گھل مل جائیں جس میں روح اور جسم ،

(ڈونلڈ بیب گوک)

18 ستمبر 1958

کوئٹے تک

(۱)

صدیوں سے راہ تکتی ہوئی گھاٹیوں میں تم ،
اک لمحہ آکے ہنس گئے ، میں ڈھونڈتا ، پھرا
ان وادیوں میں برف کے چھینٹوں کے ساتھ ساتھ
ہرسُو شرر برس گئے ، میں ڈھونڈتا ، پھرا
راتیں ترائیوں کی تہوں میں لڑھک گئیں
دن دلدلوں میں دھنس گئے ، میں ڈھونڈتا ، پھرا
راہیں دھوئیں سے بھر گئیں ، میں منتظر رہا ،
قرنوں کے رُخ جھلس گئے ، میں ڈھونڈتا پھرا
تم پھر نہ آسکو گے ، بتانا تو تھا ، مجھے
تم دور جاکے بس گئے ، میں ڈھونڈتا پھرا

(۲)

برس گیا بہ خراباتِ آرزو ، ترا غم ،
قدح قدح تری یادیں سبو سبو ، ترا غم
ترے خیال کے پہلو سے اٹھ کے جب دیکھا
مہک رہا تھا زمانے میں کو بہ کو، ترا غم
غبارِ رنگ میں رس ڈھونڈتی کرن تری دھن
گرفتِ سنگ میں بل کھاتی آبجو ترا غم

ندی پہ چاند کا پرتو ترا نشانِ قدم

خطِ سحر پہ اندھیروں کا رقص، تو، ترا غم

ہے جس کی رو میں شگوفے، وہ فصل، تیرا دھیان

ہے جس کے لمس میں ٹھنڈک، وہ، گرم لو، ترا غم

نخیلِ زیست کی چھاؤں میں، نے بہ لب، تری یاد

فصیلِ دل کے کلس پر ستارہ جُو، ترا غم

طلوعِ مہر، شگفتِ سحر سیاہیٔ شب،

تری طلب، تجھے پانے کی آرزو، ترا غم

نگہ اٹھی تو زمانے کے سامنے، ترا روپ،

پلک جھکی تو مرے دل کے رو برو، ترا غم

کوئٹہ22 نومبر 1958

میونخ

———آج کرسمس ہے!
شہر میونخ میں آج کرسمس ہے!

رود بارِ عسار کے پل پر،
جس جگہ برف کی سِلوں کی سڑک
فان کاچے کی سمت مڑتی ہے
قافلے قہقہوں کے اُترے ہیں
آج اس قریۂ شراب کے لوگ
جن کے رخ پر ہزیمتوں کا عرق———
جن کے دل میں جراحتوں کی خراش
ایک عزمِ نشاط جو کے ساتھ
اُمڈ آئے ہیں مست راہوں پر
باہیں باہوں میں، ہونٹ ہونٹوں پر!

برف گرتی ہے ساز بجتے ہیں،
کوئے میریں کے اک گھروندے میں
ایک بوڑھی، اداس، ماں کے لئے
پھول اک طاقچے پہ ہنستے ہیں

گرم انگیٹھی کے عکسِ لرزاں سے
آگ اک آئنے میں جلتی ہے!
ایک دستک ہے! کون آیا ہے!
زرد کمرے کے گوشے گوشے میں
جورِ ماضی کا سایۂ مصلوب
آخری سانس لینے لگتا ہے!

ماں کے چہرے کی ہر عمیق شکن
ایک حیران مسکراہٹ کے
دلنشیں زاویوں میں ڈھلتی ہے
"میری شالاط، اے مری شالاط
اے میں قرباں، تم آ گئیں، بیٹی!"
اور وہ دختِ ارضِ الماں، جب
سر سے گٹھڑی اُتار کر جھک کر
اپنی امی کے پاؤں پڑتی ہے
اس کی پلکوں پہ ملک ملک کی گرد
ایک آنسو میں ڈوب جاتی ہے!

ایک مفتوح قوم کی بیٹی
پارۂ ناں کے واسطے، تنہا،

روئے عالم کی خاک چھان آئی !

دس برس کے طویل عرصے کے بعد
آج وہ اپنے ساتھ کیا لائی ؟
روح میں ، دیس دیس کے موسم !

بزمِ دوراں سے کیا ملا اس کو
سیپ کی چوڑیاں ، ملایا سے
کینچلی چین کے اک اژدر کی
ٹھیکری اک مہنجو دارو کی ،
ایک نازک بیاض پر ، مرا نام
کون سمجھے گا ، اس پہیلی کو ؟

فاصلوں کی کمند سے آزاد ،
میرا دل ہے کے شہرِ میونخ ہے
چار سو ، جس طرف کوئی دیکھے
برف گرتی ہے ، ساز بجتے ہیں ۔

شاخِ چنار

یہ کیا دیکھتا ہوں،

کھڑا سوچتا ہوں ———

اس اک لمحے کے چوکھٹے میں یہ منظر اُتارا ہے کس نے؟

چنارِ شرر برگ کی ایک ٹہنی،
کسی جابرِ برف پیکر کے پھیلے ہوئے منجمد بازؤں سے نکل کر
پھسل کر،
فرازِ فضا میں، بڑی خود فروزی سے لہرا رہی ہے
نجانے اسے ماگھ رت کے سہانے سمے میں سموئے ہوئے نیلگوں آسماں سے
پکارا ہے کس نے ———

(رچرڈ ایلڈرچ)

14 ستمبر 1958

افسانے

پھر کلی بن کے کوئی ناچتی آہٹ نہ کھلی
پھر کوئی ہنسی نہ بجی
ریگ زاروں کے تپکتے سے چمکتے سے نشیب
منزلِ لیلیٰ کے قریب !
قصرِ پرویز کی دہلیز پہ یہ روندی ہوئی سل
دل، کسی فرہاد کا دل !
اک بھنور، ایک گھڑا ، ایک خیالِ محبوب
سو دکھی روحوں کا غروب !
برف انبار دیاروں کے کسی پھول کا دھیان
پر جلی تتلی کی، اُڑان !
ہاں، یہ سب جھلسی روایات میں اگنی بھرے خواب
دشتِ حقیقت کے سراب!
ہاں ، یہ سب کچھ فقط آرائشِ افسانہ سہی !
صورتِ دنیا نہ سہی !

پھر بھی سچ پوچھو تو یہ آندھیاں چاتی بھی رہیں ،
مشعلیں جلتی بھی رہیں ،
کاش میں بھی ترے سوچوں بھرے نینوں میں جلوں
ایک فسانے میں ڈھلوں

30 جون 1959

غزل

اک شوقِ بے اماں کے یہ نخچیر کون ہیں

اے موجۂ ہوا، تہِ زنجیر کون ہیں،

دیوارِ دل کے ساتھ، بہ پیکانِ غم گڑے،

آ، دیکھ یہ ترے ہدفِ تیر کون ہیں،

یہ بدلیوں کا شور، یہ گھنگھور قربتیں،

بارش میں بھیگتے یہ دو رہگیر کون ہیں،

ان ریزہ ریزہ آئینوں کے روپ میں بتا،

صدیوں کے طاق پر فلکِ پیر، کون ہیں،

جن کی پلک پلک پہ ترے بام و در کے دیپ

پہچان تو سہی، کہ یہ دلگیر کون ہیں،

امجد، دیارِ لعل و گہر میں، کسے خبر،

وہ جن کی خاکِ پا بھی ہے اکسیر کون ہیں،

30 جولائی 1956

ریلوے اسٹیشن پر

آہنی سبز رنگ جنگلے کے پاس ،
باتوں باتوں میں ایک برگِ عقیق
تونے جب توڑ کر مسل ڈالا
مجھے احساس بھی نہ تھا ، کہ یہی
جاوداں لمحہ ، شاخ دوراں سے
جھڑ کے ، اک عمر ، میری دنیا پر
اپنی کمھلاہٹیں بکھیرے گا   اسی برگِ دریدہ جاں کی طرح

آج بھی اس دہکتی پٹڑی پر ،
گھومتے گھنگھناتے پہیوں کو
سیٹیوں کی دھواں اگلتی صدا
جب پیامِ رحیل دیتی ہے
روز سو سنگتیں اُجڑتی ہیں   لاکھ سنجوگ مسکراتے ہیں

آج بھی ، ریلوے سٹیشن پر ،
آہنی ، سبز رنگ ، جنگلے کے پاس
قدِ آدم عقیق کے پودے
تھام کر سرخ دھاریوں والے
زرد پھولوں کے موہنے گجرے

بھری دنیا کے جمگھٹوں میں کھڑے
گوشت اور پوست کے وہ پیکر ہیں
اک زمانے سے جن کی زندگیاں
لوٹ کر پھر نہ آنے والوں کی ،
وقت کے جھکڑوں سے کھیلتی ہیں

منتظر منتظر چراغ بہ کف
اسی برگِ دریدہ جاں کی طرح

6 اگست 1959

نگاہِ بازگشت

آج تھی میرے مقدر میں عجب ساعتِ دید

آج جب میری نگاہوں نے پکارا تجھ کو ،
میری ان تشنہ نگاہوں کی صدا
کوئی بھی سن نہ سکا !

صرف اک تیرے ہی دل تک یہ صدا ،
جا گئی دنیا کے کہرام سے چپ چاپ گزر کر پہنچی ،
صرف اک تونے پلٹ کر مری جانب دیکھا ،
مجھے تونے ، تجھے میں نے دیکھا !

آج تھی میری نگاہوں کے مقدر میں عجب ساعتِ دید !

کیا خبر ، پھرتو پلٹ کر مری جانب کبھی دیکھے کہ نہ دیکھے ، لیکن
ایک عمر ، اب میں یونہی اپنی طرف دیکھتے دیکھوں گا تجھے

زینیا

(۱)

انگاروں کا روپ ،
جیٹھ ہاڑ کی دھوپ ،
اور اس جلتے سمے
مہکیں تیرے سنگ
رنگ رنگ کے انگ!

(۲)

پائے سوجِ نمو ،
خوشبو تج کر تو ،
اگنی پیتے پھول ،
تیری جبیں پر لاکھ
بجھے دلوں کی راکھ!

(۳)

روپ ہو کتنا انوپ
باس بناں کیا روپ ،

زینیا ایک پھول جس کے کئی رنگ ہوتے ہیں ، یہ موسم گرما میں کھلتا ہے مگر اس میں خوشبو نہیں ہوتی ۔

اس پھلواڑی میں
خوشبو کی اک لہر ،
زندگیوں کا شہر !

(۴)

جینا اُن کا ، جو
امر بہاروں کو ،
سونپ کے دل کی باگ
دُکھ کی دھوپ جلیں
رس کی بھینٹ نہ دیں

(۵)

دیکھ سکے تو دیکھ ،
جیون کے یہ لیکھ

لے کر اس جگ میں
سونے کا کشکول ،
سب اک پل کے مول،
اپنے من کی سگندھ
بیچنے آئے ہیں ،
کیا تُو—اور کیا میں

1959

ماڈرن لڑکیاں

سنہری دوپہروں رپہلی رتوں
میں ، سورج مکھی کے شگوفوں کے پاس ،
چناروں سے قد اور ستاروں سے نین
زرافشاں بدن ، زعفرانی لباس
حسیں گوریاں گنگناتی پھریں ، مٹکتی پھریں ، ڈگمگاتی پھریں ،
کڑی دھوپ میں قاشِ زر سے تراشی ہوئی پنڈلیاں
لہکتی پھریں ، تھر تھراتی پھریں

مجل راستوں سے گزر جائیں یہ ،
نگینوں بھرے آبشاروں کی طرح
زمانوں کے دل میں اترجائیں یہ
لجیلی کٹیلی کٹاروں کی طرح
سنہری دوپہروں کو ٹھنڈک عطا کرنے والے خیالوں کے جادو جگاتی پھریں ،
مٹکتی پھریں ، ڈگمگاتی پھریں

(فلپ بوتھ)

12 اگست 1959

”ہڑپے کا ایک کتبہ“

بہتی راوی ، تیرے تٹ پر ، کھیت اور پھول اور پھل ،
تین ہزار برس بوڑھی تہذیبوں کے چھلبل ،
دو بیلوں کی جیوٹ جوڑی ، اک ہالی ، اک ہل

سینۂ سنگ میں بسنے والے خداؤں کا فرمان ،
مٹی کاٹے ، مٹی چاٹے ، ہل کی انی کا مان ،
آگ میں جلتا پنجر ، ہالی کاہے کو انسان!

کوئی مٹائے اس کے ماتھے سے یہ دکھوں کی ریکھ!
ہل کو کھینچنے والے جنوروں جیسے اس کے لیکھ ،
تپتی دھوپ میں تین بیل ہیں ، تین بیل ہیں دیکھ!!

12 اگست 1959

شناور

تیرتا ہے جب تیراک ، مرگ رقص دھارے پر ،
موج سے ابھرتا ہے ، موج کے سہارے پر ،

موج پر مسلط بھی ، موج کے حوالے بھی ،
موج اسے اچھالے بھی ، موج اسے سنبھالے بھی ،

کینۂ تلاطم بھی ، ہم عنانِ دریا بھی ،
سینۂ شناور بھی ، در میانِ دریا بھی ،

لاکھ لاکھ طوفاں ہیں ، ایک ایک قطرے میں ،
تیرنے کی شکتی ہے ، ڈوبنے کے خطرے میں ،

جُو بہ جُو تھپیڑے ہیں ، آتشیں خیالوں کے ،
تیرتے ہیں دل جن میں ، پیار کرنے والوں کے ،

پریمیوں کی باہوں میں ، چاہتوں کا دریا ہے ،
تیرنے کی قدغن ہے ، ڈوبنے کا کھٹکا ہے ،

لہر لہر کی دھڑکن ، درد کا قرینہ بھی ،
لہر لہر کی کروٹ ، زندگی کا زینہ بھی ،

کتنے دل جو موجوں کی ، چوٹ چوٹ سہتے ہیں
اس بھنور کے گھیرے میں ، پھول بن کے بہتے ہیں

(رابرٹ فرانسس)

18 اگست 1959

وہ ایک دن بھی عجیب دن تھا

تم آئے ، بادل اُمڈ کے آئے
ہزار ہا رنگتوں کے سائے
فضائے دوراں پہ تھر تھرائے !

تم آئے — اور برگ ِ صد شجر سے
الجھنے والی شعاعِ زر سے
تمہاری زلفوں پہ پھول برسے !

عجیب دن تھا ، ہر ایک پتی سَنور رہی تھی
ہر ایک موجِ ہوا تڑپ کر گزر رہی تھی
جدھر بھی دیکھا ، ہر ایک شے رقص کر رہی تھی

پہاڑ صدیوں سے جن کے سنگین پاؤں پاتال میں گڑے تھے
دھڑام سے دفعتہً ، ابلتے ہوئے سمندر میں گر پڑے تھے
پھر ایک لمحے کے بعد ، اٹھ کر ، اسی طرح چپ اٹل کھڑے تھے

ندی کا پانی جو اک زمانے سے بہہ رہا تھا
اچانک اک پل کو چلتے چلتے ٹھٹک گیا تھا
بس ایک لمحے کو تھم کے پھر بہنے لگ پڑا تھا

ہمارے قدموں تلے زمیں اک عجیب اندازِ مطمئن میں
سرکتی بڑھتی رواں تھی ان بے نشاں دیاروں کی سمت ، جن میں
ہزار شام و سحر کے کھلیان جل اٹھے تھے اس ایک دن میں !

(فلپ مُرے)

28 اگست 1959

دنیا سب کچھ تیرا

دریا ، دریا ، بجتے ساز
صحرا ، صحرا ، گاتی دھوپ
نگری ، نگری ، موہن سکھ،
بام بام پر چاند
کرن کرن ، گلنار ،
آسمانوں اور زمینوں کے سب روپ
دنیا سب کچھ تیرا———

تیرے طاق میں اک دیپ
تو صدیوں کے گارے میں اک گندھی ہوئی دیوار
میں اک پل کی راکھ
اک دھڑکن کی ہوک

تو نے نیل گگن سے بھر کر ساغرِ زہر اک شام
مجھ سے کہا : پی لے یہ جام
میں نے آگ پہ رکھ دیئے ہونٹ
میں اک جلتی روح

بجھ گئی عُود کی شمع
گر گئی بے بس راکھ
رات کے پربت سے ٹکرا گئی خوشبو کی اک لہر

امر زمانوں کے سنگم پر

پھر وہی رنگ اور پھر وہی روپ

نگری ، نگری ، موہن مکھ

بام بام پر چاند

کرن کرن ، گلنار !

یکم نومبر 1959

کیلنڈر کی تصویر

اچانک جو ہوٹل کی دیوار کے
اک اونچے دریچے میں لٹکی ہوئی
شبیہِ حسیں پر نظر جا رکی
پیالی مرے ہاتھ سے گر پڑی

کہا دل سے میں نے کہ "اے خوش خرد!
نگاریں ہے جس سے ترے غم کا ظرف
وہ خطِ جبیں،
وہ خالِ سبیں
نہیں، یہ نہیں
زباں پر نہ لا، یوں اس نامِ شیریں کے حرف
کہاں تیرے شعلے، کہاں شہرِ برف!"
اسی سوچ میں تھا کہ دیوارِ دل پر اک عکس ابھرا مرے روبرو،

وہی وضعِ رُو،
وہی قطعِ مُو،
وہی ہُو بہو،
خراباتِ ایّام میں چار سو،
کھنکنے لگے طاقچوں پر سبو!

1959

غزل

جب اک چراغِ راہگزر کی کرن پڑے،
ہونٹوں کی لو لطیف حجابوں سے چھن پڑے

شاخِ ابد سے جھڑتے زمانوں کا روپ ہیں
یہ لوگ، جن کے رخ پہ گمانِ چمن پڑے

یہ کس حسیں دیار کی ٹھنڈی ہوا چلی
ہر موجۂ خیال پہ صدہا شکن پڑے

یہ کون ہے، لبوں میں رسیلی رُتیں گھلی
پلکوں کی اوٹ، نیند میں گل گوں گگن پڑے

اک پل بھی کوئے دل میں نہ ٹھہرا وہ رہ نورد
اب جس کے نقشِ پا میں چمن در چمن پڑے

اک جست اس طرف بھی، غزالِ زمانہ رقص
وہ تیری دیکھتے ہیں خطا و ختن پڑے

جب انجمن تموّجِ صد گفتگو میں ہو
میری طرف بھی اک نگہِ کم سخن پڑے

صحرائے زندگی میں جدھر بھی قدم اٹھیں
رستے میں ایک آرزوؤں کا چمن پڑے

اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ
میں اپنی زندگی انہیں دے دوں جو بن پڑے

اے شاطرِ ازل ترے ہاتھوں کو چوم لوں
قرعے میں میرے نام جو دیوانہ پن پڑے

اے صبح دیر خیز ، انہیں آواز دے جو ہیں
اک شام زود خواب کے سکھ میں مگن پڑے

امجد ، طریق سے میں ہے یہ احتیاط شرط
اک داغ بھی کہیں نہ سر پیر ہن پڑے

ایک فوٹو

لے کر نیلم جڑے تھال میں ، نیل کمل کے پھول
کس شردھا سے کھڑا ہے تیرے چرنوں کے نزدیک
ٹھہری ٹھہری ، گہری جھیل کا شیتل شیتل جل
پتلی ، پیچان ، بیلڑیوں کے جھرسٹ کے اوجھل
جھیل کنارے تو بیٹھی ہے ، اپنے آپ میں گم
تیرے پاؤں تلے ، پانی پر ، نیلوفر کے پھول
جن پہ چھڑکنے آئی ہے ، البیلی رتوں کے روپ ،
تیتریوں کے پروں کی پیلی چادر اوڑھ کے دھوپ !

نیلی جھیل، سجیلے پھول البیلی رت اور تو
ایک تری یہ بھیجی ہوئی رنگیں تصویر اور میں
روشن کمرہ ، جگ مگ یادیں ، نیر بہاتی چاہ
باہر ، کالی رات کی ساکت جھیل ، سیاہ ، اتھاہ
ایک کنارے جیون کی رتنار رتوں کے سنگ
تیرا سہانا دیس ، برستی برف ، کھنکتے ساز ،
ایک کنارے امرت پیتے ، جیتے جگوں کی اوٹ
میری آخری سانس کی دھیمی بے آواز ، آواز

1959

سایوں کا سندیس

بھیگی بھیگی ، نتھری نتھری ، روشنیوں کا دن

رستے رستے پر بے برگ درختوں کے سائے
دھوپ کے پیلے آنچل پر مٹیالے گل بوٹے
دنیا ان کو روند گئی یہ خاک کے مٹ نہ سکے

میٹھی میٹھی ٹھنڈک ، نکھرا نکھرا دن اور میں

بھیگے رستوں سے یہ سائے چننے آیا ہوں
میرے من میں ہیں جو جھمیلے، ان سے کیوں الجھوں
اپنی جھولی آج ان مسلے پھولوں سے بھرلوں

شیتل شیتل دھوپ میں بہتے سایوں کا یہ کھیل

اک ڈالی کی ڈولتی چھایا ، لاکھ اسٹ ارمان
تھر تھر کانپیں سوکھے پتے جھم جھم جھمکیں دھیان
یہی بہت ہے پت جھڑ کی اس سہمی رت کا مان

2 فروری 1960

توسیع شہر

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر، بانکے پہرے دار
گھنے، سہانے، چھاؤں چھڑکتے، بور لدے چھتنار،
بیس ہزار میں بک گئے سارے، ہرے بھرے اشجار
جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم،
قاتل تیشے چیر گئے اُن ساونتوں کے جسم،

گری دھڑام سے گھائل پیڑوں کی نیلی دیوار،
کٹتے ہیکل، جھڑتے پنجر، چھٹتے برگ و بار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار

آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار
اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک، اے آدم کی آل

9 فروری 1960

غزل

گہرے سُروں میں عرضِ نوائے حیات کر
سینے پہ ایک درد کی سِل رکھ کے بات کر

یہ دوریوں کا سیلِ رواں، برگِ نامہ، بھیج
یہ فاصلوں کے بندِ گراں، کوئی بات کر

تیرا دیار، رات، مری بانسری کی لے
اس خوابِ دلنشیں کو مری کائنات کر

میرے غموں کو اپنے خیالوں میں بار دے
ان الجھنوں کو سلسلۂ واقعات کر

آ ایک دن، مرے دلِ ویراں میں بیٹھ کر
اس دشت کے سکوتِ سخن جُو سے بات کر

امجد، نشاطِ زیست اسی کشمکش میں ہے
مرنے کا قصد، جینے کا عزم، ایک ساتھ کر

21 جولائی 1960

سفرِ درد

سطحِ سحر ، سفینۂ غم ، جوئے لالہ گوں
کنجاہ کی گلی کا سکوتِ اجل سکوں
قاتل کا وار ، سینۂ صد لخت ، موجِ خوں
اک صاحبِ قلم پہ جو گزری میں کیا کروں،
نوک اُس کے دل کو چیر گئی جس کٹار کی
اس پر گرفت تھی ستمِ روزگار کی

اک ہاتھ بڑھ کے شانۂ دیوار پر رکھا ،
وہ زد ، وہ چند ڈولتے قدموں کا فاصلہ ،
اک گام——اور جادۂ دوراں سمٹ گیا
اک سانس——اور سب سفرِ درد طے ہوا
اک آخری تڑپ جسدِ لرزہ گیر کی
مٹی پہ ایک قوس لہو کی لکیر کی!

اک زندگی کراہتے لمحوں میں ڈھل گئی
اک شمعِ موجِ اشک پہ بجھ بجھ کے جل گئی
اک بے گنہ پہ ظلم کی شمشیر چل گئی
خونی انی پہ ایک جوانی مچل گئی
ہے بھی یہاں غریب کی ہستی کا کوئی مول
میں پوچھتا ہوں ، مدعیٔ عدل، کچھ تو بول

18 ستمبر 1960

نظم

دکھ کا ہر بھروپ انوکھا ،
ہر الجھن کا روپ انوکھا ،
غم کو جب اس دھرتی پر پرکھا ،
اک پل دھوپ اور اک پل برکھا
دردوں کے بندھن میں تڑپیں
لاکھوں جسم اور لاکھوں روحیں
میں جس آگ سے کلیاں چھانوں
میرا قصہ ہے ، میں جانوں ۔

شام ہوئی ہے سوچ رہا ہوں
تُو سُورج ہے ، میں دنیا ہوں
لوٹ کے آنا ، تیرے بس میں
تجھ کو پانا ، تیرے بس میں ،

سایوں کی اک اک کروٹ پر
زنجیروں میں ڈوب گیا ہوں
دل میں چند شرارے لے کر
اپنی راکھ سے کھیل رہا ہوں

26 ستمبر 1960

صدا بھی مرگِ صدا،

(۱۹۵۸ کے مارشل لا پر ، شاعر کے عدم احتجاج کا کفارہ)

(۱)

نہ کوئی سقفِ منقّش ، نہ کوئی چترِ حریر
نہ کوئی چادرِ گل اور نہ کوئی سایۂ تاک ،
بس ایک تودۂ خاک ،
بس ایک ٹھیکریوں سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان
بس ایک اندھے گڑھے میں ہجومِ کرمک و کور
بس ایک قبّۂ گور
نہ کوئی لوحِ مسطّر ، نہ کوئی خشتِ نشاں ،

(۲)

یہیں پہ دفن ہے وہ صاحبِ سخن ، کہ جسے
نظامِ دنیا نے ،
ہزار مرتبہ عرضِ نوا کی دعوت دی
مگر وہ اپنی فصیلِ خیال میں محصور ،
وہ زمانہ سے دور
خروشِ برقِ سرِ نیستاں سے بے پروا
سکوتِ سینۂ یک چوبِ نے میں ڈوب گیا
صدا بھی مرگِ صدا!

(۳)

یہیں پہ دفن ہے ، — وہ روح ، جس کی دھیمی آگ
کبھی جو ڈھل بھی سکی تو ڈھلی بہ قالبِ حرف ،
پہن کے جامۂ برف !

(۴)

ضمیرِ ارض پہ کھینچی گئی لہو کی لکیر ،
اور اس کا ایک بھی چھینٹا نہیں سر قرطاس ،
پہ مصحفِ احساس !

(۵)

ستم کی تیغ چلی ، گردنوں کی فصل کٹی ،
اور اس تمام فسانے کی اک بھی سطرِ حزیں ،
زبورِ غم میں نہیں !

(٦)

پکارتی رہیں پیہم کراہتی صدیاں
اور ایک گونج بھی اُن کی نہیں صدا انداز
بہ گنبدِ الفاظ !

(۷)

پہاڑ لرزے ، ستاروں کی بستیاں ڈولیں
اُلٹ سکی نہ مگر رخ سے پردۂ افسوں،
روایتِ مضموں !

(۸)

یہیں پہ دفن ہے وہ جسم ، وہ روایتِ خاک ،
وہ دل کہ جس کے دھڑکتے ہوئے بیانِ الم
کو چھو سکا نہ قلم !

(۹)

یہیں پہ گلتی ہوئی ہڈیوں کے ڈھیر میں اب
دبے پڑے ہیں وہ لمحے ، جو رزقِ سم نہ بنے ،
نوائے غم نہ بنے !

(۱۰)

یہیں پہ ، ریزۂ سل بن کے جم گئے ہیں وہ ھات
جو اشکبار زمانوں کی موجِ رقصاں سے
شرار چن نہ سکے !

(۱۱)

کرید کر، کوئی اس راکھ کو اگر دیکھے،
تو آج ایک رگِ سنگ ہے وہ نبضِ تپاں
وہ جوئے خونِ رواں،
وہ زندگی کے تلاطم میں ڈوبتی ہوئی آگ
صریرِ خامہ کی تقدیس بیچتا ہوا فن،
تمام گردِ کفن!

(۱۲)

یہ کرم خوردہ اساطیر کا بلند الوند
یہ سب درست مگر پھر بھی اک سوال ہے آج
جواب کا محتاج!

(۱۳)

کوئی بتائے کہ اُس وقت کیا کرے انساں
جب آسمان کی آنکھوں سے روشنی چھینیں،
ستم کی سنگینیں!

(۱۴)

یہی سوال ، اب اس قبر کے اندھیروں میں
ہزار رینگتے کیڑوں کی سرسراہٹ ہے ،
اجل کی آہٹ ہے !

(۱۵)

یہ قبر طنز ہے ان لازوال ارادوں پر
نگل گئے جنہیں ظلمت کے خشمگیں عفریت
مقدّروں پہ محیط !

(۱۶)

مقدّروں کے دھوئیں سے اُبھرتے رہگیرو ،
نشان اس کا مٹاتے چلو زدِ پا سے ،
جبینِ دنیا سے !

1959

برگ و بر پر، بام و در پر، برف —— برف،
ایک نگری —— برف —— برف،

زرد سورج، سیم گوں سیداں، رُپہلی سیڑھیاں
سیڑھیوں کی سوج اندر سوج ڈھلوانوں پہ چہرے، چتر چتر ——
سیڑھیوں پر سو قمر قوس آئینوں کی اوٹ اوٹ ——،
منتظر نظروں کی دنیا —— عکس عکس ——،

کتنے رنگوں سے جو زیبِ دامنِ احساس تھے
بھر گئے تھے گل بداماں راستے،
جانے کس کے واسطے!

ساز جاگے، پھول برسے، اک نوا،
اک صدا، جیسے سلگتی چاہتوں کے دیس سے آتی صدا،
اک صدا، جیسے زمانوں کے اندھیروں میں صدادیتی وفاؤں کی صدا،
اک صدا، جیسے مرے دل کی صدا

لَے تھمی —— اور نغمہ گر کا پیکرِ بے جاں گرا،
سیڑھیوں سے آسماں کی ٹوٹتی محراب تک،

بکھرے پھولوں کی چٹختی پنکھڑیوں پر——تیز قدموں کی دھمک ،
آہٹوں کے اس بھنور میں اک جھجکتی چاپ کی دھیمی جھنک ،
میرے دل کی دھڑکنوں کو روندنے والی کسک ،

——رات——بجھتی شمع——نیندوں کا غبار ،
برف کی زنجیر میں جکڑے ہوئے جھونکوں کی بزم ،

میں کہاں تھا ، کچھ بتا اے دل کی لو پر ناچتی نا گفتہ نظم ،

یکم جنوری 1961

صبح کے اُجالے میں ــــــــــ

تونے ہم سفر دیکھا ، صبح کے اجالے میں ، راہ کا سہانا پن

دائیں بائیں ، دو رویہ ، شادماں درختوں کی جھومتی قطاریں ہیں

ہر قدم کے وقفے پر ، دُھوپ کی خلیجیں ہیں ، چھاؤں کے جزیرے ہیں ،

جس طرف کو سورج ہے ، اس طرف درختوں کی شبنمی جبینوں پر

تیرگی کا پرتو ہے ،

تیرگی کے پرتو کا رُخ ہماری جانب ہے

جس طرف کو سورج ہے ، اس کی دوسری جانب ، سربلند پیڑوں کی شبنمی جبینوں پر

روشنی کا پر تو ہے ،

روشنی کے پر تو کا رخ ہماری جانب ہے

تونے ہم سفر دیکھا ، دھوپ ہے کہ سایا ہے ، رہروؤں کی مایا ہے ،

دور دور تنگ رستہ ، دور دور تک دنیا ، دور دور تک سب کچھ ، اک عجب سہانا پن

صبح کے اجالے میں

متروکہ مکان

یہ محلّے ، یہ گھروندے ، یہ جھروکے ، یہ مکاں
ہم سے پہلے بھی ، یہاں
بس رہے تھے سکھ بھرے آنگن—سُنہری بستیاں

جانے والے گھر کی چاہت سے تہی پہلو نہ تھے ،
اتنے بے قابو نہ تھے ،
روکتا کون—اس جھکی محراب کے بازو نہ تھے—

اک اٹل ہونی کی زنجیروں میں جکڑے قافلے
ساتھ لے جاتے اسے ،
بات صرف اتنی کہ اس دیوار کے پاؤں نہ تھے ،

اب وہ روحیں گونجتے جھکّڑ میں گُھلتی سسکیاں
اُن کے مسکن—یہ مکاں
منہدم ادوار کے ملبے پہ جلتی ارتھیاں——

راکھ ہوتی ہڈیوں کے گرم گارے میں گُندھی ،
گرتے اشکوں میں ڈھلی
اب یہی اینٹیں—ہماری عظمتِ افتادگی !

پڑ گئے ، اینٹوں کے مُڑتے زاویوں کے بس میں ہم
بھول کے سب اپنے غم، اس دامِ خِشت و خس میں ہم
بھِڑ گئے آپس میں ہم

یہ محلّے ، یہ منڈیریں ، یہ محل ، یہ منڈلیاں
کون دیکھے ——— اب یہاں
کھنچ گئی ہیں کتنی دیواریں دلوں کے درمیاں

بھر لئے ہم نے ان ایوانوں میں تھے جتنے شگاف
——————— ،
کون دیکھے ، آسماں کی چھت میں ہیں کتنے شگاف

8 جنوری 1961

بہار

ہر بار، اسی طرح سے دنیا،
سونے کی ڈلی سے ڈھالتی ہے
سرسوں کی کلی کی زرد مورت،
——تھاما ہے جسے غمِ ہوا نے

ہر بار، اسی طرح سے، شاخیں
کھاتی ہوئی کونپلیں اٹھائے،
رستوں کے سلاخچوں سے لگ کر،
——کیا سوچتی ہیں، یہ کون جانے،

ہر بار، اسی طرح سے، بوندیں
رنگوں بھری بدلیوں سے چھن کر
آتی ہیں مسافتوں پہ پھیلے،
——چاندی کے ورق کو ٹھنٹھنانے،

ہر سال، اسی طرح کا موسم،
ہر بار، یہی مہکتی دوری،
ہر صبح، یہی کٹھور آنسو،
——رونے کے کب آئیں گے زمانے

28 جنوری 1961

غزل

چہرہ اُداس اُداس تھا ، میلا لباس تھا
کیا دن تھے جب خیالِ تمنا لباس تھا

عریاں ، زمانہ گیر ، شررگوں ، جبلّتیں
کچھ تھا تو ایک برگِ دل ان کا لباس تھا

اس موڑ پر ابھی جسے دیکھا ہے ، کون تھا
سنبھلی ہوئی نگاہ تھی ، سادہ لباس تھا

یادوں کے دھندلے دیس، کھلی چاندنی، میں، رات
تیرا سکوت کس کی صدا کا لباس تھا

ایسے بھی لوگ ہیں، جنہیں پرکھا تو اُن کی روح
بے پیرہن تھی ، جسم سراپا لباس تھا

صدیوں کے گھاٹ پر ، بھرے میلوں کی بھیڑ میں
اے دردِ شادماں ، تیرا کیا کیا لباس تھا

دیکھا ، تو دل کے سامنے ، سایوں کے جشن میں ،
ہر عکسِ آرزو کا انوکھا لباس تھا

امجد ، قبائے شہ تھی کہ چولا فقیر کا ،
ہر بھیس میں ضمیر کا پردا لباس تھا

12 مارچ 1961

دوام

کڑکتے زلزلے امڈے ، فلک کی چھت گری ، جلتے نگر ڈولے
قیامت آ گئی ، سورج کی کالی ڈھال سے ٹکرا گئی دنیا
کہیں بجھتے ستاروں، راکھ ہوتی کائناتوں کے رکے انبوہ میں — کروٹ دو سایوں کی ،
کہیں اس کھولتے لاوے میں بل کھاتے جہانوں کے سیہ پشتے کے اوجھل
—— ادھ کھلی کھڑکی

کوئی دم توڑتی صدیوں کے گرتے چوکھٹے سے جھانکتا چہرا
زمینوں آسمانوں کی دھکتی گرد سے لتھڑے خنک ہونٹوں سے یوں پیوست ہے
اب بھی
ابھی جیسے سحر بستی پہ جیتی دھوپ کی مایا انڈیلے گی
گلی جاگے گی ، آنگن ہمہمائیں گے
کوئی نیندوں لدی پلکوں کے سنگ اٹھ کر کہے گا — "رات کتنی تیز تھی آندھی"

6 مارچ 1961

بول انمول

اب یہ مسافت کیسے طے ہو ، اے دل تُو ہی بتا
کٹتی عمر اور گھٹتے فاصلے، پھر بھی وہی صحرا ،

چیت آیا ، چیتاؤنی بھیجی ، "اپنا و چن نبھا"
پت جھڑ آئی ، پتر لکھے " آ، جیون بیت چلا"

خوشیوں کا سکھ چوم کے دیکھا ، دنیا مان بھری
دکھ وہ سجن کٹھور کہ جس کو روح کرے سجدا

اپنا پیکر ، اپنا سایا ، کالے کوس کٹھن ،
دُوری کی جب سنگت ٹوٹی ، کوئی قریب نہ تھا

شیشے کی دیوار زمانہ، آمنے سامنے ہم ،
نظروں سے نظروں کا بندھن ، جسم سے جسم جدا

اپنے گرد ، آپ ، اپنے آپ میں گھلتی سوچ بھلی
کس کے دوست اور کیسے دشمن، سب کو دیکھ لیا

راہیں دھڑکیں، شاخیں کڑکیں، اک اک ٹیس اٹل
کتنی تیز چلی ہے اب کے دھول بھری دکھنا

دکھڑے کہتے لاکھوں مکھڑے، کس کس کی سنیئے
بولی تو اک اک کی ویسی، بانی سب کی جدا

اپریل 1961

پامال

سورج نکلا رنگ رچے
کرنوں کے قدموں کے تلے سوکھی گھاس پر کھلتے ہوئے پیلے پیلے پھول ہنسے

کرنوں کے قدموں پر، جب اس مٹی نے رکھ دیئے لب،
مسکی گھاس پہ بچھ گئی سب ہنستی زندگیوں کی چھب

اس مٹی کے ذرّے، ہم
کیا کہیں اپنا قصۂ غم
کیا کہیں ہم پر کیا بیتی
اندھے کھوئے قدموں کی ٹھوکر اپنی قسمت تھی ٹھوکر کھائی آنکھ
کُھلی

آنکھ کھلی تو بھید کھلا
وہ سب جن کے قدموں کا ریلا ہم کو روند گیا ان میں سورج کوئی
نہ تھا
میری طرح اور تیری طرح
سب مٹی کے ذرے تھے!

ستمبر 1961

بھادوں

گدلی گدلی جھیل ہوا کی ، جس کے خنک پاتال میں ہم ،
سانس روک کے ڈھونڈ رہے ہیں ، جیون کے انمول خزانے ، گھائل خوشیاں ،
چنچل غم

سب کچھ ایک اداس تھکن کے بندھن ، کیا ماضی، کیا حال
ایک اتھاہ لگن کی کڑیاں ، سبز درخت اورکالے کھمبے ، ٹھنڈے کنج اور جلتے جال

باہر بھورے بادل کی سلوٹ میں تانبے کی ڈوری
اور اپنے اندر جھانکیں تو دل کی کل میں ایک کمانی، وقت کے چلتے پہیے کی ،

سدا رہے یہ سماں سہانا اور یہ ٹیس اک درد بھری
مدہم جھونکے ، بھیگی پلکیں ، گیلی دھرتی ، دھندلا ابر ، کھلتی کونپل بھادوں کی

22 ستمبر 1961

غزل

اب کے تمہارے دیس کا یہ روپ نیارا تھا
بکھرا ہوا ہواؤں میں سایہ تمہارا تھا

گم سم کھڑے ہیں اونچی فصیلوں کے کنگرے
کوئی صدا نہیں۔ مجھے کس نے پکارا تھا

رات ، آسماں پہ چاند کی منڈلی میں کون تھا
تم تھے کہ اک ستار بجاتا ستارا تھا

ان دوریوں میں قرب کا جادو عذاب تھا
ورنہ تمہارے ہجر کا غم بھی گوارا تھا

دل سے جو ٹیس اٹھی ، میں یہ سمجھا ، پجاریو
پتھر کے دیوتا کا تڑپتا اشارا تھا

تالی بجی تو سامنے ناٹک کی رات تھی
آنکھیں کھلیں تو بجھتے دلوں کا نظارا تھا

دنیا کے اس بھنور سے جب ابھرے دکھوں کے بھید
اک اک اتھاہ بھید ، خود اپنا کنارا تھا

پھر لوٹ کر نہ آیا زمانے گزر گئے
وہ لمحہ جس میں ایک زمانہ گزارا تھا

ستمبر 1961

معاشرہ

ہر طرف رات کے اندھیروں کے
سرسراتے وجود، سایوں کی طرح
دبے پاؤں رواں ہیں، کیا کیجے
جب ذرا بھی سسکتی روحوں کی
کوئی ناداں، نچنت انگڑائی
اپنا بوجھل لباس اتارتی ہے
سائے رکتے میں، سائے ہنستے ہیں

رات، خاموشیاں، دھڑکتے دل
صحن میں چارپائیوں کے گرد
ہمہ تن گوش، جاگتی دیوار
جھانکتا سر، منڈیر پہ گملا
دیکھتی آنکھ، نیم وا روزن
جب ذرا بھی برہنہ سپنوں کی
کوئی رو پیرہن سنبھالتی ہے
ایک دھیمی سی چاپ، نیند کی نیند
دو قدم بڑھ کے لوٹ جاتی ہے۔

رات کے فرش پر قدم رکھتی
ساعتیں اپنے ساتھ لائی ہیں
کتنے ارمان ، کتنی زنجیریں
جب بھی جھونکوں کی گدگدی سے، کسی
آرزو کی قبا مسکتی ہے ،
جب بھی پگھلے دلوں کے جوشن کا
بند کوئی ذرا چٹختا ہے ،
سایوں کے دیو ، اپنے کالے مکٹ
ابروؤں کی شکن پہ سر کا کر
جاگتی کروٹوں کو گھورتے ہیں

یکم اکتوبر 1961

صاحب کا فروٹ فارم

یہ دھوپ جس کا سہین آنچل

ہوا سے مس ہے

رتوں کا رس ہے

تمام چاندی ، جو نرم مٹی نے پھوٹتے بور کی چٹکتی چنبیلیوں میں انڈیل دی ہے

تمام سونا ، جو پانیوں ، ٹہنیوں ، شگوفوں میں بہ کے ان زرد سنگتروں سے

اُبل پڑا ہے

تمام دھرتی کا دھن ، جو بھیدوں کے بھیس میں دور دور تک سرد ڈالیوں

پر بکھر گیا ہے

رتوں کا رس ہے—— رتوں کے رس کو

گداز کر لو ،

سبو میں بھر لو ،

یہ پتیوں پر جمے ہوئے زرد زرد شعلے ، یہ شاخساروں پہ پیلے پیلے پھلوں کے گچّھے

جو سبز صبحوں کی سج میں پل کر ، کڑی دوپہروں کی رو میں ڈھل کر ، خنک

شعاعوں کی اوس پی کر

رتوں کے امرت سے اپنے نازک وجود کے آبگینے بھر کر ، حدِ نظر تک ،

بساطِ زر پر

لہک رہے ہیں ، شراب ان کی کشید کر لو ،

سبو میں بھر لو ،

سبو میں بھر لو ، یہ مدھ، یہ مدرا ، کہ اس کی ہر بوند سال بھر سو صراحیوں
میں دیئے جلائے
یہی قرینہ ہے زندگی کا ، اسی طرح سے لپکتے قرنوں کے اس چمن میں ، نہ جانے ،
کب سے
ہزارہا تپتے پیلے سورج ، لنڈھا رہے ہیں وہ پگھلا تانبا ، وہ دھوپ جس کا
سہین آنچل
دلوں سے مس ہے ، وہ زہر جس میں دکھوں کا رس ہے
جو ہوسکے تو اس آگ سے بھر لو من کی چھاگل
کبھی کبھی ایک بوند اس کی، کسی نوا میں دیا جلائے
تو وقت کی پینگ جھول جائے !

8 مارچ 1962

غزل

میری مانند، خود نگر، تنہا،
یہ صراحی میں پھول نرگس کا،

اتنی شمعیں تھیں تیری یادوں کی
اپناسایہ بھی، اپنا سایہ نہ تھا

میرے نزدیک تیری دوری تھی
کوئی منزل تھی، کوئی عالم تھا

ہائے وہ زندگی فریب آنکھیں
اُس نے کیا سوچا، میں نے کیا سمجھا

صبح کی دھوپ ہے، کہ رستوں پر
منجمد بجلیوں کا اک دریا

گھنگھروؤں کی جھنک منک میں بسی
تیری آہٹ، مَیں کس خیال میں تھا

کون یاد آگیا تھا، یاد نہیں
دل بھی اک ضرب بھول بھول گیا

سارے بندھن کڑے سہی لیکن
تجھ سے یہ ربط ، دھندلا اور گہرا

پھر کہیں دل کے برج پر کوئی عکس
فاصلوں کی فصیل سے اُبھرا

پھول مرجھا نہ جائیں ہجروں میں
مانجھیو ، کوئی گیت ساحل کا

وقت کی سرحدیں سمٹ جاتیں
تیری دوری سے کچھ بعید نہ تھا

عمر جاتی ہے ، بخت جلوؤں کے
زیست مٹی ہے ، بھاگ مٹی کا

رہیں دردوں کی چوکیاں چوکس
پھول لوہے کی باڑ پر بھی کِھلا

جو خود ان کے دلوں میں تھا تہِ سنگ
وہ خزانہ کسی کسی کو ملا !

لاکھ قدریں تھیں زندگانی کی
یہ محیط، ایک عجیب زاویہ تھا

سانس کی رو میں رو بما طوفاں
تیغ کی دھار پر بہے دھارا

ہے جو یہ سر پہ گیان کی گٹھڑی
کھول کر بھی اسے کبھی دیکھا

روز جھکتا ہے کوئے دل کی طرف
کاخِ صد بام کا کوئی زینہ،

امجد، ان آنسوؤں کو آگ لگے
کتنا نرم اورگراں ہے یہ دریا

7 مئی 1962

دو دلوں کے درمیاں

شام کی بُجھتی ہوئی لو ایک اَن بوجھی کسک ،
پانیوں ، پگڈنڈیوں ، پیڑوں پہ سونے کی ڈلک ،
جامنوں کے بُور کی دھیمی مہک میں ، دُور تک ،
جسم اندر جسم سائے ، لب بہ لب پرچھائیاں

انگ انگ انگڑائیاں

ہائے یہ مدّھم سے شعلے اس مقدس آگ کے ،
جس کی لپٹوں میں سدا سمٹے رہے ، پھیلے رہے ،
تیرے ہونٹوں اور مرے ہونٹوں کے جلتے فاصلے
ساتھ چلتی ، سنگتوں کے سنگ بھی دوریاں

دو دلوں کے درمیاں

17 مئی 1962

بار کش

چیختے پہیّے ، پتھ پتھریلا ، چلتے بجتے سُم ،
تپتے لہو کی رَو سے بندھی ہوئی اک لوہے کی چٹان
بوجھ کھینچتے ، چابک کھاتے ، جنور ترا یہ جتن
کالی کھال کے نیچے ، گرم گٹھیلے ماس کا مان

لیکن تیری ابلتی آنکھیں ، آگ بھری ، پُر آب ،
سارا بوجھ اور سارا کشٹ ان آنکھوں کی تقدیر ،
لاکھوں گیانی من میں ڈوب کے ڈھونڈیں جگ کے بھید
کوئی تیری آنکھوں سے بھی دیکھے ، دنیا کی تصویر ،

6 جون 1962

وقت

وقت ہے اک حریم بے دیوار
جس کے دوّار آنگنوں میں سدا ،
رقص کرتے ہوئے گزرتے ہیں ،
دائروں میں ہزارہا ادوار !

بیتتی بات ، آنے والی آن
سب زمانے ، تمام عرصۂ دہر
امرِ امروز اور فرِ فردا
وقت کی ایک تیز لہر کی عمر !

کل وہ سب کچھ تھا، جو کچھ آج بھی ہے
آج جو کچھ ہے ، اُس زمانے میں تھا
جب وہ سب کچھ کہ جس نے ہونا ہے ،
ہوچکا تھا ، یہ کھیل ہونی کے !

لاکھ قرنوں کے ان قرینوں میں
صرف اک پل ، بسیط ، بے مدت ،
نہ کوئی دن نہ سِن، نہ یوم، نہ عصر
اپنے بھیدوں کی حد میں لامحدود

وقت بہتا ہوا وہ دھارا ہے
وقت جیتی حقیقتوں کا جتن
جس کی رو خنجروں کی دھار نہیں
مرنے والے ، کبھی مرے ہی نہیں

اتنے پہلو ہیں ، اس پہیلی کے
اور اک ہم ، کہ جن کے علم کی یم
ہے فقط انگلیوں کا لمس اور بس
ہائے اندھی روایتوں کے طلسم

(ترجمہ) 29 جون 1962

لاہور

کوئی کچھ بھی کہے ، کہے ، مجھے کیا
بات جو میرے دل میں ہے ——— میں اگر
آج اپنی زباں پہ لا نہ سکا ،
کل ، مرے بعد ، تیری منڈلی پہ ، جب
آگ برسے گی ، کون بولے گا !

بات یہ ہے ، عظیم شہر ، تجھے
شاید اس بات کا گماں بھی نہ ہو
ایک دن آئیگا ——————خدا نہ کرے
کبھی وہ دن بھی آئے ———جب ترے برج
قَدر انداز دشمنوں سے بھرے
آگ انڈیلیں گے تیری گلیوں پر
——— تیری گلیاں ، کہ جن میں بستے ہیں آج
لوگ ، نیندوں میں تیرتے پیکر
لوگ ، ڈھلتی مسرتوں سے نڈھال
زنگ کے پھول ، شاخِ آہن پر !

کوئی دیکھے اگر تو ، شہرِ شہیر ،
جن سجیلی سلوں پہ کھینچی تھی ،

تو نے گل کار سلسلوں کی لکیر،
ان کی جھڑتی تہوں میں دفن ہیں آج
پھول برساتی بجلیوں کے ضمیر،
دیکھتے دیکھتے بکھر بھی گئی،
مٹتے کھنڈروں کو جیتے آنگنوں سے
جوڑنے والی آنسوؤں کی لکیر
میں نے اکثر سنی ہے تیری کراہ
کھوکھلے قہقہوں کی بھیڑ میں بھی!

یوں گری وقت کی کمان کی زہ،
سب کٹیلے طلسم ٹوٹ گئے
رہ گئے ہم، سو اپنا حال ہے یہ
اتنی نازک ہیں الجھنیں اپنی
جیسے پنکھڑی میں دھاریوں کی گرہ،

یاد بھی ہے کہ مٹنے والوں نے
تیری مٹی کو رکھ کے پلکوں پر
یہ قسم کھائی تھی کہ تیرے لئے
اسی دھرتی سے، ہم، دھڑکتی ہوئی
زندگی کا خراج مانگیں گے

اسی دھرتی پہ، آج شہرِ جمیل
کتنی اونچی ہے کتنی کڑیل ہے
تیری بے سنگ سرحدوں کی فصیل
جس کے گھیرے میں گھاٹیوں کی گھٹا
جس کی خندق، سمندروں کی سبیل

یہی بل کھاتی جاگتی دیوار
جو دلوں کی سلوں سے ڈھالی گئی
آج جب اس کے کنگروں کی قطار
صفِ سوزاں ہے، ہم نہیں چونکے
کل جب اس کے سلگتے رخنوں کے پار
خون چھلکے گا، ہم نہیں ہوں گے
ہم نہیں ہونگے، لیکن، اے مرے دیس
ایک دن آئے گا——خدا نہ کرے
کبھی وہ دن بھی آئے، جب ترے برج
قدرؔ انداز دشمنوں سے بھرے،
تیری گلیوں پہ آگ انڈیلیں گے
تیری گلیاں — کہ جن کے سایوں میں، کل
لڑکھڑاتے مقدروں کے پرے
ٹوٹتی سیڑھیوں سے اُتریں گے

خون کی موج سے ابھرتی ہوئی
قوم کی وردیاں پہن لینگے،
ہم بھی اے کاش دیکھ سکتے انہیں
کون ہونگے وہ لوگ جن کے بدن
خود ہمارے لہو کی دیواریں
جن کے سینوں میں سنسناتے الاؤ
خود انہی کے شعور کی لپٹیں!

یوں تو کس کو خبر ہے کل کیا ہو
پھر بھی، اے شہرِ خوش قبا، تیرے
دوش پر ہے جس آفتاب کی ڈھال
جب یہ سورج بدستِ فردا ہو
جب قدم ظلمتوں کا پسپا ہو
یاد رکھنا کہ یہ رتیں، فصلیں
یہ بہاریں، جو آگ کی رو سے
زندگی کے گلاب کا رس لیں
رو گئی ہیں کہاں کسے معلوم ——
کتنی بے عزم زرد رُو نسلیں
یعنی بے عزم زرد رُو پیکر،
—— چند خوشیوں کا سوگ جن کے جتن

——چند خوابوں کی گرد جن کے نگر
یہی ہم ، جن کی ہر تڑپ سے ہے ، آج
سو شکن دشمنوں کے ماتھوں پر

فتح اس آتشیں شکن کی شکست
جو ترے دشمنوں کے ماتھے پہ ہے
کتنی ان مٹ ہے ، کون جانتا ہے
یہی ریکھا جو تیرے ہاتھوں پہ ہے

28 اگست 1962

مشاہیر

کیا لوگ تھے، جن کی گردن پر
تلوار چلی !———اک سرد تڑپ
——اک خون میں لتھڑی ہوئی کروٹ
اور وقت کے سیمیں دھارے پر
اک سطر لہو کی چھوڑ گئے !

اچھے تھے وہ جن کو سولی کی
رسّی سے لٹک کر نیند آئی
اک تیز کھٹک ! اک سرد تڑپ
اور وقت کی دکھتی چیخوں میں
اک شبد کی شکتی چھوڑ گئے

مٹی بھی اب ان ساونتوں کی
ان کھوئے ہوئے کھنڈروں میں نہیں
اک سطر لہو کی ، کانپتی ہے !
اک شبد کی شکتی ڈولتی ہے
تاریخ کی گلتی پستک پر
اک نام کا دھبا باقی ہے

کیا کچھ نہ ملا ان جیالوں کو
شعلوں پہ قدم رکھنے میں سکوں
جینے کے لئے ، مرنے کی لگن!
اے وائے وہ جلتی روحیں ، جنھیں
ہر درد ملا، منزل نہ ملی!

کل ان کی زرہ پوش آرزوئیں
جس آگ کی رو میں بہتی ہوئی
نیزوں کی انی پہ ناچ گئیں
وہ آگ ، تمہاری دنیا ہے
آگ ، تمہارے پاؤں تلے
جتنوں کی لہکتی جنت ہے

اس اگنی سے ، اس جیتے جگوں
کی کھلتی ہوئی پھلواڑی سے
دو چار دہکتے پھول چنو
اتنا ہی سہی ، اتنا تو کرو
تاریخ کی گلتی پستک پر
اک نام کا دھبّا ہو کہ نہ ہو

حربے

زندگی کے اسلحہ خانے سے اُس روح زبوں کو کیا ملا:
صرف دو ترچھے سے ابرو ، صرف دو پتلے سے ہونٹ ،
کتنے سہلک ہیں یہ حربے کیا کہوں ،——

جب بھی کوئی شبھ گھڑی
اس کے دل پر کھینچ دیتی ہے سنہری زاوئیے
جب بھی میٹھے مکر کی جھوٹی ہنسی
اس کے چہرے پر بچھا دیتی ہے زرّیں زاوئیے
اس کی ترچھی کانپتی جھکی بھویں ،
——دو کٹاریں ، جن کے اکھڑے اکھڑے قبضے ، انکھڑیاں ،
اُس کے پتلے مسکراتے ٹیڑھے ہونٹ ،
——آریاں ، جن کی دنتیلی دھار ، دانت ،
ٹوٹ پڑتی ہیں دلوں پر اس طرح
بے سپر سچائیوں پر اس طرح کرتے ہیں وار ،
جیسے باقی جتنی جوہر دار قدریں زندگی کے اسلحہ خانے میں ہیں ،

سب ہیچ ہیں ،

جانے ، کتنی ایسی روحیں ان کمیں گاہوں میں ہیں
کون ہو ان کا حریف ،

کاش خود ان کا ضمیرِ بے نیام
ان کی آہن پوش تقدیروں کو گھائل کرسکے
کاش اس خنداں ہزیمت کا تصور ، ایک دن ،
ہوسکے خود ان کے دل پر حملہ آور ، فتح یاب

غزل

جودل نے کہہ دی ہے وہ بات ان کہی بھی نہ تھی
یہ سوچ تو تہِ دریا کبھی رہی بھی نہ تھی

جھکیں جو سوچتی پلکیں ، تو میری دنیا کو
ڈبو گئی وہ ندی جو ابھی بہی بھی نہ تھی

سنی جو بات کوئی ان سنی تو یاد آیا
وہ دل کہ جس کی کہانی کبھی کہی بھی نہ تھی

نگر نگر وہی آنکھیں ، پسِ زماں ، پسِ در
مری خطا کی سزا ، عمرِ گمرہی بھی نہ تھی

کسی کی روح تک اک فاصلہ خیال کا تھا
کبھی کبھی تو یہ دوری رہی سہی بھی نہ تھی

نشے کی رو میں یہ جھلکا ہے کیوں نشے کا شعور
اس آگ میں تو کوئی آبِ آگہی بھی نہ تھی

غموں کی راکھ سے امجد ، وہ غم طلوع ہوئے ،
جنھیں نصیب اک آہِ سحر گہی بھی نہ تھی

1962

غزل

بڑھی جو حد سے تو سارے طلسم توڑ گئی
وہ خوش دلی، جو دلوں کو دلوں سے جوڑ گئی
ابد کی راہ پہ بے خواب دھڑکنوں کی دھمک
جو سو گئے انہیں بجھتے جگوں میں چھوڑ گئی
یہ زندگی کی لگن ہے کہ رت جگوں کی ترنگ
جو جاگتے تھے انہی کو یہ دھن جھنجھوڑ گئی؟
وہ ایک ٹیس جسے تیرا نام یاد رہا ،
کبھی کبھی تو مرے دل کا ساتھ چھوڑ گئی
رکا رکا ترے لب پر عجب سخن تھا کوئی
تری نگہ بھی جسے نا تمام چھوڑ گئی
فرازِ دل سے اترتی ہوئی ندی ، امجد
جہاں جہاں تھا حسیں وادیوں کا موڑ ، گئی

10 نومبر 1962

دل پتھر کا ———

اس پتھر پر اک اک پل کی گھائل آنچ بھی گھاؤ
اس پنکھڑی کو بہا نہ سکا طوفانوں کا بھی بہاؤ
دل ، پتھر کا ،
پتھر ، پنکھڑی پھول کی ؛

دل کیا جانے کہاں ہے وہ بے انت سمے کا پڑاؤ ،
جہاں پہ جل کر راکھ ہوئے ہیں زندگیوں کے الاؤ ،
دل جو سنے تو جکڑے ہوئے سنّاٹوں کی یہ کراہ ،
اک سندیس ہے :
"جینے والو ہم کو یاد نہ آؤ"

دل کو یاد کریں وہ سمے دل بھول چکا وہ سبھاؤ :
رات کی میلی کروٹ ، آخری سانسوں کا ٹھہراؤ
کسی امر ارمان کی ہچکی ، کسی صدا کے شبد

کہیں سے ڈھونڈو ان شبدوں کو
اے بے مہر ہواؤ
کبھی کھلے پتھر پر پنکھڑی پھول کی ،

جنوری 1963

ہوٹل میں

بادل گرجا——گرے سنہری پردے دلوں ، دریچوں پر——

بند ہوئے دو گول پپوٹے ، چونچ میں دب گئی گرم زبان
چھری چلی حلقوم پہ ، تڑپا تپتے توے پر تڑختا ماس
سج گئے میز پہ مے کے پیالے ، بٹ گیا طشتوں میں پکوان

چھت پر بارش ، نیچے ، اُجلے کالر ، گدلی انتڑیاں
ہنستے مکھ ، ڈکراتی قدریں ، بھوکی مایا کے سب مان

باہر——ٹھنڈی رات کا گہرا کیچڑ—— درد بھرے آدرش
چلو یہاں سے——ہمیں پکارے ننگی سوچوں کا رتھ بان

ایک شام

دیکھ پھر آج بھی اس نگری میں ، شام کی کرنیں تیرے ساتھ چلی ہیں
تیرے ساتھ چلی ہیں ،
دیکھ اب کہیں کہیں ان لمبی لال لووں کی لڑیاں ، بجھ کر ، رستوں سے پیوست
پڑی ہیں
کہیں کہیں یہ زرد سلگتے تیکھے بان دلوں میں چبھ کر ٹوٹ گئے ہیں
آسمان سے لے کر سطحِ زمیں تک ہر سو پھیل گئی ہیں——لاکھ خراشیں ،
دکھتی خراشیں ، گہری ، الجھی ہوئی لہریلی
پگھلی ہوئی بے جسم سلاخیں ، پتلی پتلی ، پیلی پیلی ،
دیکھ اب ان سیّال سلاخوں کی چمکیلی باڑ پہ جتنے پھول تھے ، ان کو توڑ کر
لے گئے جھونکے
اور اب باقی صرف اک سرد سیاہ الجھاؤ !

بجھتی ہوئی اک سانس کے قیدی ،
دیکھا اب تیرے سامنے ہیں وہ سارے سرد سیاہ زمانے ،
جن کے بھنور میں تیرے دیپ کی لو اس وقت سے لرزاں ہے ،
پہلا سورج صدیوں پہلے جب تِرے دل میں ڈوبا تھا !

30 اپریل 1962

غزل

جو ہوسکے تو، مرے دل، اب اک وہ قصہ بھی
ذرا سنا کہ ہے کچھ ذکر جس میں تیرا بھی

کبھی سفر ہی سفر میں جو عمرِ رفتہ کی سمت،
پلٹ کے دیکھا تو اڑتی تھی گردِ فردا بھی

بڑے سلیقے سے دنیا نے میرے دل کو دیئے
وہ گھاؤ، جن میں تھا سچائیوں کا چرکا بھی

کسی کی روح سے تھا ربط، اپنے حصے میں تھی
وہ بے کلی، جو ہے موجِ زماں کا حصہ بھی

یہ آنکھیں، ہنستی وفائیں، یہ پلکیں، جھکتے خلوص
کچھ اس سے بڑھ کے کسی نے کسی کو سمجھا بھی

یہ رسم، حاصلِ دنیا ہے، اک یہ رسمِ سلوک،
ہزار اس میں سہی نفرتوں کا ایما بھی

دلوں کی آنچ سے تھا، برف کی سلوں پہ کبھی
سیاہ سانسوں میں لتھڑا ہوا پسینا بھی

مجھے ڈھکی چھپی ان بوجھی الجھنوں سے ملا
جچی تلی ہوئی اک سانس کا بھروسا بھی

کبھی کبھی انہی الھڑ ہواؤں میں، امجد
سنا ہے دور کے اک دیس کا سندیسا بھی

29 جولائی 1963

سانحات

کوئی بھی واقعہ کبھی تنہا نہیں ہوا
ہر سانحہ اک الجھی ہوئی واردات ہے

آندھی چلے تو گرتی ہوئی پتیوں کے ساتھ
لاکھوں صداقتوں کے ہیں ڈانڈے ملے ہوئے
دیکھے کوئی تو دیکھتی آنکھوں کے سامنے
کیا کچھ نہیں کہ دیکھنا جس کا محال ہے!

اک جام اُٹھا کے میں نے زمیں پر پٹخ دیا
سوچو، اس ایک لمحے میں کیا کچھ نہیں ہوا
ہر سمت، ڈھیر صد صدف سانحات کے
قوسِ کنارِ قلزمِ دوراں پہ لگ گئے
پرکھو تو رنگ رنگ کی ان سیپیوں پہ ہے
لہروں کے تازیانوں کی تحریر الگ الگ!

چاہو تو واقعات کے ان خرمنوں سے تم
اک ریزہ چن کے فکر کے دریا میں پھینک دو
پانی پہ اک تڑپتی شکن دیکھ کر ہنسو!

چاہو تو واقعات کی ان آندھیوں میں بھی
تم یوں کھڑے رہو کہ تمہیں علم تک نہ ہو
طوفاں میں گھر گئے ہو کہ طوفاں کا جزو ہو

1963

غزل

اپنے دل کی چٹان سے پوچھو ریزہ اک پنکھڑی کا کتنا بوجھل ہے
اک آنسو کی بوند میں دیکھو ، دنیا دنیا ، عالم عالم ، جل تھل ہے

جس کو دیکھو اپنے سفر کی دنیا بھی ہے ، اپنے سفر میں تنہا بھی ———
قدم قدم پر اپنے آپ کے سامنے ہے اور اپنے آپ سے اوجھل ہے !

روح سے روح کا نازک بندھن ، پھولوں کی زنجیر میں جکڑی زندگیاں
کتنے دکھ ہیں کتنا چین ہے ، کیسی دھوپ ہے ، کتنا گھرا بادل ہے

آنکھ کی پتلی ، سانس کی ڈوری ، دل کی تھاپ ، اک پل کی نرت کا تماشا ہے
گلی کھوپڑیوں سے چنی دیواروں پر اک جلتی جوت کی جھل جھل ہے

ایک زمانے سے یہی رستہ زیرِ قدم ہے ، اک اک جھونکا محرم ہے ،
آج جو من کی اوٹ سے دیکھا ، ہر سو اک ان دیکھی رت کی چھل بل ہے

بہتی روشنیاں ، بے کار شعاعیں ، بکھری ٹھیکریاں ، بے حرف سلیں
اک دن انت یہی ہے ، مگر وہ ایک کرن جو دل کے ورق پر جدول ہے

جنوری 1963

پہاڑوں کے بیٹے

مرے دیس کی اُن زمینوں کے بیٹے ،
جہاں صرف بے برگ پتھر ہیں صدیوں سے تنہا ،
جہاں صرف بے مہر موسم ہیں، اور ایک دردوں کا سیلاب ہے عمر پیما ،

پہاڑوں کے بیٹے ،
چنبیلی کی بکھری ہوئی پنکھڑیاں ، سنگِ خارا کے ریزے
سجل دودھیا نرم جسم اور کڑے کھردرے سانولے دل
شعاعوں ہواؤں کے زخمی
چٹانوں سے گر کر خود اپنے ہی قدموں کی مٹی میں اپنا وطن ڈھونڈتے ہیں

وطن ڈھیر اک ان منجھے برتنوں کا
جسے زندگی کے پسینوں میں ڈوبی ہوئی محنتیں در بدر ڈھونڈتی ہیں ،

وطن وہ مسافر اندھیرا
جو اونچے پہاڑوں سے گرتی ہوئی ندیوں کے کناروں پہ شاداب شہروں میں رک کر
کسی آہنی چھت سے اُٹھتا دھواں بن گیا ہے

ندی بھی زر افشاں ، دھواں بھی زر افشاں
مگر پانیوں اور پسینوں کے انمول دھارے میں جس درد کی موج ہے عمر پیما
ضمیروں کے قاتل اگر اس کو پرکھیں
تو سینوں میں کالی چٹانیں پگھل جائیں

14 اپریل 1963

ریزہ جاں

ہماری زندگیوں کے سمندروں میں چھپے
کہیں دلوں کی تہوں میں ، عجیب اندیشے !
کبھی کبھی، انھی لہروں کی گونج میں ، ہم نے
اک آنے والے تموّج کی سیٹیاں بھی سنیں ،

مگر یہ کس کو خبر ، کیا ہے اک وہ ربطِ عمیق
وہ گھور اندھیروں کا ترکہ ہمارے ذہنوں میں
وہ اک ہوس بھری حس—جو ہوا میں بہتے ہوئے
سیاہ لمحوں کی آہٹ کو بھانپ لیتی ہے !

کسے خبر ہے کہ اس جان و تن کی گتھی میں ،
لہو کی پگھلی سلاخوں کے اس جھمیلے میں
کڑی وہ کون سی ہے ، اُلجھے سلسلوں کی کڑی
کہ جس کی دل میں یہ مدھم سی اک جھنک، پھر آج
مرے لئے کوئی مگھم سی بات لائی ہے !

میں ڈر گیا ہوں—پراسرار واسطوں کے نظام
یہ خوف ہی تو ہے اک وہ حصار بے دیوار ،
جو میرے دل کو تری ہستیوں نے بخشا ہے ،

تری ہی دین ، سیہ سانحوں کو سونگھتی حس
ترا ہی خوف ، اس ان بوجھے رابطے کا ثمر

میں ایک ریزۂ جاں اُن عجب قرینوں میں
ترے ہی خوف کی زد میں، تری گرفت میں ہوں
ترے ہی ربط کی حد میں——تری پناہ میں ہوں

ایکٹریس کا کنٹریکٹ

مرا وجود مری زندگی کا بھید ہے دیکھ،
——— یہ ایک ہونٹ کے شعلے پہ برگِ گل سے خراش
——— یہ ایک جسم کے کندن میں گدگدی سے گداز،
——— یہ ایک روح بھنچے بازوؤں میں کھیلتی لہر!
ذرا قریب تو آ ——— دیکھ تیرے سامنے ہیں
یہ سرخ رس بھرے لب جن کی اک جھلک کے لئے
کبھی قبیلوں کے دل جوشنوں میں دھڑکے تھے
جو تو کہے تو یہی ہونٹ سرخ رس بھرے ہونٹ
ترے لہو میں شگوفے کھلا بھی سکتے ہیں!
قریب آ، یہ بدن، میری زندگی کا طلسم
تری نگاہ کی چنگاریوں کا پیاسا ہے
جو تو کہے تو یہی نرم لہریا آنچل
یہی نقاب مری چٹکیوں میں اٹکی ہوئی
یہی ردا، مری انگڑائیوں سے مسکی ہوئی
یہ آبشار، ڈھلانوں سے گر بھی سکتی ہے!
بس ایک شرط ——— یہ گوہر سطور دستاویز،
ذرا کوئی یہ وثیقہ رقم کرے تو سہی
اکائیوں کے ادھر جتنے دائرے ہوں گے!
ادھر بھی، اتنے ہی عکس ان برہنہ شعلوں کے!

1963

غزل

جاوداں قدروں کی شمعیں بجھ گئیں تو جل اٹھی تقدیرِ دل
اب تو اس مٹی کے ہر ذی روح ذرے میں بھی ہے تصویرِ دل
اپنے دل کی راکھ چن کر ، کاش ان لمحوں کی بہتی آگ میں
میں بھی اک سیّال شعلے کے ورق پر لکھ سکوں تفسیرِ دل
میں نہ سمجھا ، ورنہ ہنگاموں بھری دنیا میں اک آہٹ کے سنگ
کوئی تو تھا ، آج جس کا قہقہہ دل میں ہے دامن گیرِ دل
رت بدلتے ہی چمن جُو ہم صفیر ، اب کے بھی ، اتنی دور سے
آکے جب اس شاخ پر چہکے ، مرے دل میں بجی زنجیرِ دل
کیا سفر تھا ، بے صدا صدیوں کے پُل کے اس طرف، اس موڑ تک
پے بہ پے ابھرا ، سنہری گرد سے ، اک نالۂ دلگیرِ دل
وار دنیا نے کئے مجھ پر ، تو ، امجد ، میں نے اس گھمسان میں
کس طرح ، جی ہار کر ، رکھ دی نیامِ حرف میں شمشیرِ دل

31 اگست 1963

مرے خدا، مرے دل

مرے ضمیر کے بھیدوں کو جاننے والے ،

تجھے تو اس کی خبر ہے ،

مرے خدا مرے دل ،

کہ میں اِن آندھیوں میں عمر بھر جدھر بھی بہا ،
کوئی بھی دھن تھی ، — میں اُس لہر کی گرفت میں تھا
جو مری سوچ کی سچّائیوں میں کھولتی ہے
ہے جس کی لَو میں تری ضَو ،

مرے خدا ، میرے دل

مرے لہو میں تری لَو ہے دھڑکنوں کا الاؤ
تجھے تو اس کی خبر ہے ،

مرے خدا ، مرے دل

کہ اس طلسمِ زیاں کے کسی جھمیلے میں ،
ذرا کبھی جو قدم میرے ڈگمگا بھی گئے ،
تو اک خیال ، ابَد موج سلسلوں کا خیال
مرے وجود میں چنگاریاں بکھیر گیا ،
سنبھل کے دیکھا تو دنیا میں اور کچھ بھی نہ تھا
نہ دکھتی سانس کے ارماں، نہ جیتی مٹّی کے لوبھ

نہ کوئی روگ نہ چنتا ، نہ میں ، نہ میرے جتن
جو مجھ میں تھا بھی کوئی گُن ، ترے گیان سے تھا
کچھ اور ڈوب کے گہرائیوں میں جب دیکھا
تو ہر سلگتی ہوئی قدر کے مقدّر میں
نہاں تھے تیرے تقاضے ،

مرے خدا ، مرے دل

ہیں تیری کرنوں میں کڑیاں چمکتے قرنوں کی ،
تجھے تو اس کی خبر ہے ،

مرے خدا ، مرے دل

کہ اِس کرے پہ ہے جو کچھ بھی، اس کے پہلو میں ہیں
وہ شعلے ، جن پہ شکن ہے تری ہی کروٹ کی
ترے ہی دائرے کا جزو ہیں وہ دَور کہ جب
چٹانیں پگھلیں ، ستارے جلے ، زمانے ڈھلے
وہ گردشیں ، جنہیں اپنا کے آن گنت سورج
ترے سفر میں بجھے تو انہی اندھیروں سے
دوام درد کی اک صبح ابھری ، پھول کھلے
مہک اٹھی ، تری دنیا ،

مرے خدا مرے دل

گُھلا ہوا مری سانسوں میں ہے سفر تیرا
تجھے تو اس کی خبر ہے،

مرے خدا، مرے دل

کہ گو یہی مرا پیکر خمیرِ خاک سے ہے
مگر اسی مرے تپتے بدن کی بھٹّی سے
کشید ہوتی ہوئی ایک ایک ساعتِ زیست
وہ گھونٹ زہر کا ہے جو مجھی کو پینا پڑا
یہ زہر کون پیئے، کون اپنے سینے میں
یہ آگ انڈیل کے ان ساحلوں سے بھید چُنے
جہاں پہ بکھرے ہیں صدہا صداقتوں کے صدف!
یہ زہر کون پیئے، کون بجھتی آنکھوں سے
غروبِ وقت کی خندق کے پار دیکھ سکے
جہاں ازل کے بیاباں میں عُمر پیما ہے
حقیقتوں کا وہ دھارا، کہ جس کی لہروں میں آج
گلوں کا رس بھی ہے، فولاد کا پسینہ بھی
میرا شعور انہی گھاٹیوں میں بھٹکا ہے
قدم قدم پہ مری ٹھوکروں کی زد میں رہیں
کرخت ٹھیکریاں اُن کٹھور ماتھوں کی
جو زندگی میں ترے آستاں پہ جُھک نہ سکے

قدم قدم پہ سیہ فاصلوں کے سنگم پر
بس اک مُجھی کو اُس ان سٹ تڑپ سے حصہ ملا
تری جرس کی صدا میں ہیں رت جگے جس کے
یہی تڑپ تری کایا ، یہی تڑپ مرا انت
جو انت بھی ہو ، سو ہو ، میں تو سنتی مٹّی ہوں
دھڑکتی ریت کے بے انت جھکّڑوں میں سدا
رواں رہیں ترے محمل ،

مرے خدا ، مرے دل

تری ہی آگ کی میٹھی سی آنچ ہیں مرے دُکھ ،
یہ راز تو ہی بتا اب ،

مرے خدا ، مرے دل

یہ بات کیا کہ ترے بے خزاں خزانوں سے
جو کچھ ملا بھی ہے مجھ کو تو اک یہ ریزۂ درد
ہیں جس کی جھولی میں کھلیان، تیرے شعلوں کے
اور اب کہ سامنے جلتی حدوں کی سرحد ہے
ہر ایک سمت مری گھات میں ہیں وہ رُوحیں
جو اپنے آپ میں اک راکھ کا سمندر ہیں
یہ روحیں ، بس بھرے ، ذی جسم ، آہنی سائے

انہی کے گھیرے میں ہیں اب یہ بستیاں یہ دیار
کہیں یہ سائے جو پتھرائی آرزوؤں کو
سرابِ زر کی کشش بن کے گُدگُداتے ہیں
مری لگن کو نہ ڈسنے لگیں ، میں ڈرتا ہوں
کہیں یہ سائے ، یہ کیچڑ کی سورتیں ، جن کے
بدن کے دھبّوں پہ رختِ حریر کی ہے پھبن
مری کرن کی نہ چھب نوچ لیں، میں ڈرتا ہوں
کہیں یہ آگ نہ بُجھ جائے، جس کے انگ میں ہیں
ترے دوام کی انگڑائیاں ، میں سوچتا ہوں
نہیں! یہ ہو نہ سکیگا! جویوں ہوا بھی تو پھر ؟
نہیں! ابھی تو یہ اک سانس، ابھی تو ہے کیا کچھ،
ابھی تو جلتی حدوں کی حدیں ہیں لا محدود ،
ابھی تو اِس مرے سینے کے ایک گوشے میں
کہیں لہو کے تریڑوں میں، برگِ مرگ پہ، اک
کوئی لرزتا جزیرہ سا تیرتا ہے ، جہاں
ہر اک طلب تری دھڑکن میں ڈوب جاتی ہے ،
ہر اک صدا ہے کوئی دور کی صدا ، مرے دل
مرے خدا ، مرے دل

4 ستمبر 1964

پچاسویں پت جھڑ

اتنا بھرپور سماں تھا ، مگر اب کے تو ہر اک گرتے ہوئے پتے کے ساتھ ،
اور اک مٹی کی تہ —— میرے لہو میں تیَری ،
اور اک ریت کی سلوٹ —— میرے دل میں ابھری ،
اور اک زنگ کی پپڑی —— مری سانسوں پہ جمی ،
اتنا بھرپور سماں تھا مگر اب کے تو مجھے جس نے بھی دیکھا یہ کہا :
" جانے کیا بات ہوئی ، کچھ تو بتا ،
تیرے ہونٹوں سے تو اب ایک وہ مرجھائی ہوئی موجِ تبسّم بھی گئی ——"
میں یہ اب کس کو بتاؤں کہ مرے پیکر میں
اک تپش ایسی بھی ہے ، جس کے سبب ،
روح کی راکھ پہ شعلوں کی شکن پڑتی ہے ،
سانس کے بل میں پنپنے کی سکت بٹتی ہے ،
ٹوٹتی کڑیوں میں ، جینے کے جتن جڑتے ہیں
میں یہ اب کس کو بتاؤں کہ مرے جسم کے ریشوں کے اِس الجھاؤ میں ہے
ایک وہ گرتی سنبھلتی ہوئی ، نازک سی ، دھڑکتی ہوئی ، لہر
جو ہر اک دکھ کی دوا ڈھالتی ہے ،
جو گزرتے ہوئے لمحوں کے قدم روکتی ہے ،
مجھ سے کہتی ہے کہ "دیکھ ایک برس اور بجھا
دیکھ اب کے تری بتّیسی پہ دھبّہ سا پڑا ، دانت گرا
گھاؤ یہ اب نہ بھریگا ، یہی بہتر ہے کہ ہونٹوں پہ لگا لے کسی جھوٹی سی کڑی
سوچ کی مہر"

اب کے تو ایک مجھی کو یہ خبر ہے کہ میں کیوں مہر بہ لب پھرتا ہوں
ورنہ سب لوگ یہی کہتے ہیں : "اس شخص کو دیکھو ، اب تو
اِس کے ہونٹوں سے وہ مرجھائی ہوئی موجِ تبسّم بھی گئی"

25 ستمبر 1964

بے نشاں

میں اب آیا ہوں ، اتنے برسوں کے بعد ،
آندھیاں آئیں ——— بدلیاں برسیں ———
دب گئیں خاک کی تہیں تہِ خاک ———
بہتی مٹّی میں بہ گئی ——————— مٹّی ،

میرے نادیدہ پیش رو ، تری قبر
کس جگہ تھی ——— یہ اب کسے معلوم

یوں ہی اپنے قیاس سے ، میں نے ،
ریت کی اک شکن کو پہچانا ————
مٹّی سطحوں پہ ایک ڈوبتی سطر ،
اک خطِ خاک ، جس پہ کچھ کنکر
میں نے پہلے تو چُن کے رکھ بھی دیئے
پھر خیال آیا ، ——— اب یہ کون کہے
قبر تیری یہیں کہیں تھی ——— مگر
تھی کہاں ؟ شاید اس جگہ تو نہ تھی
کچھ جو سوچا ——— نہ جانے کیا سوچا ،
ذہن میں لاکھ الجھ گئے خاکے ،
میں نے کنکر وہ سب بکھیر دیئے !

بے نشاں خاک ، میرے سامنے اب
اُن جہانوں کا ایک حصّہ ہے ،
جن کے بھیدوں کی تھاہ میں تُو ہے
جن کے سایوں کی قبر میں ، میں ہوں

19 اکتوبر 1964

غزل

کبھی تو سوچ : ترے سامنے نہیں گزرے ،
وہ سب سمے، جو ترے دھیان سے نہیں گزرے،

یہ اور بات کہ ہوں ان کے درمیاں میں بھی
یہ واقعے کسی تقریب سے نہیں گزرے ،

ان آئینوں میں جلے ہیں ہزار عکسِ عدم ،
دوامِ درد ، ترے رتجگے نہیں گزرے ،

بکھرتی لہروں کے ساتھ اُن دنوں کے تنکے بھی تھے،
جو دل میں بہتے ہوئے رک گئے، نہیں گزرے،

سپردگی میں بھی، اک رمزِ خود نگہداری،
وہ میرے دل سے مرے واسطے نہیں گزرے،

انہیں حقیقتِ دریا کی کیا خبر ، امجد
جو اپنی روح کی منجدھار سے نہیں گزرے ،

1964

جلوسِ جہاں

میں پیدل تھا ، میرے قریب آ کے اُس نے بہ پاسِ ادب اپنے تانگے کو روکا ،
اچانک جو بجریلی پٹڑی پہ سم کھڑکھڑائے ، سڑک پر سے پہیوں کی آہٹ پھسل
کر جو ٹھہری
تو میں نے سنا ایک خاکستری نرم لہجے میں ، مجھ سے کوئی کہہ رہا تھا
"چلیں گے کہیں آپ؟——— بازار ، منڈی ، سٹیشن ، کچہری ،
پلٹ کر جو دیکھا تو تانگے پہ کوئی سواری نہیں تھی ، فقط اک فرشتہ ، پھٹے
کپڑے پہنے ، عنانِ دو عالم کو تھاسے ہوئے تھا ،

میں پیدل تھا، اتنے میں کڑکا کوئی تازیانہ، بہا فرشِ آہن پہ ٹاپوں کا سرپٹ تریڑا ،
کوئی تند لہجے میں گرجا "ہٹو ، سامنے سے ہٹو" اور پر شور پہیے
گھناگھن مری سمت جھپٹے ، بہ مشکل سنبھل کر جو دیکھا ، کھچا کھچ
بھرے تیز تانگے کی مسند پہ، اک صورتِ سگ لجام خرس پہ جھکی تھی ،

یہ لطفِ کریمانۂ خوش دلاں بھی، یہ پر غیظ خوئے سگاں بھی ،
مرے ساتھ رو میں ہیں لوگوں کے جتنے روّیے ، یہ سب کچھ ، یہ سارے قضیّے
غرض منڈیاں ہی غرض منڈیاں ہیں ،
یہی کچھ ہے ، اس رہگزر پر متاعِ سواراں ،
میں پیدل ہوں ، مجھ کو جلوسِ جہاں سے انہی ٹھوکروں کی روایت ملی ہے

1964

ایک شبیہ

کچھ دنوں سے قریبِ دل ہے، وہ دِن
جب اچانک اسی جگہ، اک شکل
میری آنکھوں میں مسکرائی تھی

ایک پل کے لئے تو ایک وہ شکل
جانے کیا کچھ تھی، جھوٹ بھی، سچ بھی
شاید اک بھول، شاید اک پہچان

کچھ دنوں سے تو جان بوجھ کے اب
یہ سمجھنے لگا ہوں، میں ہی تو ہوں
جس کی خاطر یہ عکس اُبھرا تھا
کچھ دنوں سے تو اب میں دانستہ
اس گماں کا فریب کھاتا ہوں!

روز، اک شکل، اس دوراہے پر
اب مرا انتظار کرتی ہے،
ایک دیوار سے لگی، ہر صبح
ٹکٹکی باندھے، نیم رُخ، یکسو
اب مرا انتظار کرتی ہے
میں گزرتا ہوں، مجھ کو دیکھتی ہے

میں نہیں دیکھتا ، وہ دیکھتی ہے
اس کے چہرے کی ساخت ، ساعتِ دید
زرد ہونٹوں کی پتریاں ، پیتل
سرخ آنکھوں کی ٹکڑیاں ، قرمز
روغنی دھوپ میں دھنسے ہوئے پاؤں
منتظر منتظر ، اداس اداس

کبھی پل بھر کو ایک یہ چہرہ
جانے کیا کچھ تھا، لیکن اب تو مجھے
اپنی وہ بھول بھولتی ہی نہیں

ایک دن یہ شبیہ دیکھی تھی
کچھ دنوں سے قریب دل ہے وہ دن
کچھ دنوں سے تو بیتتے ہوئے دن
اُسی اک دن میں ڈھلتے جاتے ہیں
دن گزرتے ہیں ، اب تو یوں جیسے
عمر اسی دن کا ایک حصہ ہے
عمر گزری ، یہ دن نہیں گزرا

جس طرف جاؤں ، جس طرف دیکھوں
مجھ سے اوجھل بھی ، میرے سامنے بھی
شکل اک ٹین کے ورق پہ وہی
شکل اک دل کے چوکھٹے میں وہی !

10 اپریل 1965

ایک فلم کو دیکھ کر

دھیرے دھیرے ، ایک نڈھال سی لے میں ساز بجے ،
اُس کے انگ انگ نے اک انگڑائی لی ،
ابھری رقص کی رَو
تڑپی گھائل سی اک لَے
لچکی اُس کے بدن کی ڈھال
اک اک تیز نرت کے ساتھ
اک اک بندھن اترا ،
پلو ڈھلک ڈھلک کر
رکے ، گرے !

سامنے اک ،
جگ مگ جسم ،
گرتی ، مڑتی ، ٹوٹ ٹوٹ کے جڑتی ، مرمر کی ڈھلوان !
سب کچھ قاشیں ، خلیے ماس ، مسام
سب کچھ ایک تھرکتے بہتے عکس کا جزو
سب کچھ ، جسم کی باغی سلطنتوں کی ایک عجب دنیا
گول سڈول کُرے — انمول زمینیں — ساحل —— جھرنے —— دھوپ ——
چاندنی —— مخمل —— پھول ——
سب کچھ ، رقص کے روپ میں ڈھلتا ، ٹک ٹک چلتا ، اک متحرک عکس !

سب کچھ ، پاس بلاتے ، پیاس بڑھاتے ، ارمانوں کا سراب ،
آج اک دوست نے پاس بلاکر ، چائے پلا کر
پہلے تو کچھ دیر ادب اور شعر کی باتیں کیں ،
مجھ سے مری اک نظم سُنی
اور پھر اُس کے بعد یہ فلم ، کہ جس کے سارے قرینے تھے
مجھ پر طنز مری اس بوسیدہ سی نظم پہ طنز ،
دونوں اتنے لبادوں میں !
باہر نکلا تو سنسان سڑک تھی ، شب خزاں تھی
ٹھنڈی تیز ہوا میں ننگی شاخیں ناچ رہی تھیں !

15 اپریل 1965

درونِ شہر

مجھ سے پوچھو، یہیں کہیں اس پھلواری میں
کیسے کیسے پھول کھلے تھے،
آج اُنہی پھولوں کی مقدس پنکھڑیوں پر ہیں
کیچ کے دھبے
ان روحوں اور ان راہوں سے اُڑتی ہوئی
اس کیچ کے دھبے

مجھ سے پوچھو، یہیں کہیں ہے اسی سنہرے
اینٹوں کی تہذیب کے سینے میں اک دلدل
گدلے، مگھم، میلے کچیلے، دلوں کی دلدل
کڑوے زہرمیں لت پت رسمیں،
میں نے جن سے وفا کی ریت نبھائی
میں نے جن کی خاطر
چرکے اپنے ضمیر پہ جھیلے
سکّے اپنے دل پر داغے
پیّوں کے دندانوں میں دن کاٹے
سلوں کی دھج کوتج کے
دھجیاں اوڑھ کے
کال کی دھوپ میں کنکر رولے

کس سے پُوچھوں

مری وفا کا یہی صلہ تھا ؟ یہی کسیلی پیلی نفرت
پیتل کے جبڑوں میں کھنکنے والی
کانچ کی آنکھوں میں مسکانے والی
یہی کسیلی پیلی نفرت
مری وفا کا یہی صلہ تھا

29 اپریل 1965

یہ سر سبز پیڑوں کے سائے

سیہ سنگ تپتی سڑک پر ، یہ سرسبز پیڑوں کے سائے
ہوا اس جگہ کتنی ٹھنڈی ہے ، جھونکوں پہ سایوں کے دھبے بھی ہیں
کتنے ٹھنڈے

درختوں کے اس جھنڈ سے جب میں گزرا ،
خنک چھاؤں کی ٹکڑیاں سی مرے جسم پر تھر تھرائیں ،
مرے جسم سے گر کے ٹوٹیں ،
عجب اک اچھوتی سی ٹھنڈک مری روح میں سرسرائی ،
سہانے دنوں کی انوکھی سی ٹھنڈک ،
وہ دن کتنے اچھے تھے ، جب ایک بھیگی ہوئی سانس کی ریشمیں رو ،
مرے دل کی چنگاریوں کے پسینے سے مس تھی
وہ مبہم سی خوشیاں ، جو چھپ چھپ کے ، ہر موڑ پر نت نئے بھیس میں
آکے روحوں سے ملتی ہیں
مل کر بچھڑتی ہیں ، جیسے

ہواؤں پہ سایوں کے چھدرے سے دھبے ،
فضاؤں میں صدہا سفید و سیہ آفتابوں کے بکھرے سے ریزے
سرِ خاک ، بے ربط ، بے سطر خاکے ،
یہ سب کچھ بس اک دو قدم تک ،
پھر آگے وہی دھوپ ،

شاداب دردوں کی جانب لہکتی ہوئی

سنگریزوں پہ بہتی ہوئی

دھوپ ،

حدِ عدم تک !

6 مئی 1965

صدائے رفتگاں

"یہ واقعے کسی تقویم میں نہ تھے مذکور،———،
یہ لہریں، جو ابھی ان ساحلوں سے گزری ہیں
یہ سانحے تو ہمارے دلوں سے ابھرے تھے،

بروز جنگ صفِ دشمناں میں سب کچھ تھا
ہمارے پاس تو کچھ بھی نہ تھا، نہ مکر، نہ حرص
بس ایک سادہ سی دلدادگی تھی، اپنی متاع
ابد کا چہرہ اسی اک سپر کی اوٹ میں تھا

تمہارے پاس تو سب کچھ ہے، وہ زمانہ بھی ہے
ہمارے صدق نے اک عکس جس کا دیکھا تھا
تمہارے حصے میں مٹّی کی وہ مرادیں بھی ہیں
ہمارے دل نے کبھی جن کی آرزو بھی نہ کی!

یہ سیلِ خاک، یہ دنیا، کِسے خبر کہ یہاں
ہماری خاک بھی اب زیرِ خاک ہے کہ نہیں
سنو، سنو، یہ صدا کس کی ہے کبھی تو سنو
ہمیں تو ہیں جو شبوں کو تمہاری بستی میں
دلوں کے بند کواڑوں کو کھٹکھٹاتے ہیں،
یقینِ مرگ کی نیندوں سے کھیلتی روحو!
ہماری زیست کا اک دن کبھی بسر تو کرو،

15 مئی 1965

غزل

عمروں کے اس معمورے میں ، ہے کوئی ایسا دن بھی ، جو
روح میں اُبھرے ، پھاند کے سورج کے سیّال سمندر کو !

اتنے کام ہیں ، ان موّاج صفوں میں خوش پھرتا ہوں
لیکن آج اگر کچھ اپنے بارے میں بھی سوچا —— تو ،

ایک سفر ہے صرفِ مسافت ایک سفر ہے جزوِ سفر
جینے والے یوں بھی جیئے ہیں ، اک عمر اور زمانے —— دو !

یہ ان جانا شہر ، پرائے لوگ ، اے دل ، تم یہاں کہاں
آج اس بھیڑ میں اتنے دنوں کے بعد ملے ہو ، کیسے ہو ،

دنیا جڑی تڑی سچائی ، سب سچے ، کوئی تو کبھی ،
اس اندھیر سے نکلے اپنے جھوٹے روپ کے درشن کو

آخر اپنے ساتھ کبھی تو اک بے مہر مروت بھی ،
اپنے سارے نام بھلا کر ، کبھی خود اپنے گن تو گنو ،

کچی نیند اور جسم نے دھوپ چکھی اور دل میں پھول کھلے
گھاس کی سیج پہ میں ہوں تمہارے دھیان میں ، آنے والے دنو !

1965

خطۂ پاک

خطۂ پاک ، ترے نامِ دل آرا کی قسم ،
کتنے سچّے ہیں ، سجیلے ہیں ، جیالے ہیں وہ دل ،
جاگتی ، جیتی ، زرہ پوش چٹانوں کے وہ دل
جن کے سوّاج لہو کا سیلاب
تیری سرحد کی طرف بڑھتی ہوئی آگ سے ٹکرایا ہے

دیکھتے دیکھتے بارود کی دیوار گری
ہٹ گئے دشمن کے قدم
خندقیں اٹ گئیں شعلوں سے ، مگر ہائے وہ دل
زندہ ، ناقابلِ تسخیر ، عظیم

ہائے دلوں کی وہ فصیل ،
جاوداں اور جلیل
جس کے زینوں پہ ظفر مند ارادوں کی سپاہ
جس کے برجوں میں ملایک کے جیوش
جس کا پیکر ہے کہ اک سطرِ جلی ،
لوحِ ابد پر تاباں
آیۂ عمرِ شہیداں کی طرح !

13 ستمبر 1965

سپاہی

تم اُس وقت کیا تھے ،
تمہارے محلکوں ، تمہارے گھروں میں تو سب کچھ تھا ،
آسائشیں بھی ، وسیلے بھی ،
اس کبریائی کی ہر تمکنت بھی
سبھی کچھ تمہارے تصرّف میں تھا ، زندگی کا ہر اک آسرا بھی ،
کڑے بام و در بھی
خزانے بھی ، زر بھی
چمن بھی ، ثمر بھی
مگر تم خود اُس وقت کیا تھے ،
تمہاری نگاہوں میں دنیا دھوئیں کا بھنور تھی
جب اڑتی ہلاکت کے شہپر تمہارے سروں پر سے گزرے
تمہاری نگاہوں میں دنیا دھوئیں کا بھنور تھی

اگر اس مقدس زمیں پر مرا خون نہ بہتا
اگر دشمنوں کے گرانڈیل ٹینکوں کے نیچے
مری کڑکڑاتی ہوئی ہڈیاں خندقوں میں نہ ہوتیں
تو دوزخ کے شعلے تمہارے معطّر گھروندوں کی دہلیز پر تھے
تمہارے ہر اک بیش قیمت اثاثے کی قیمت
اسی سرخ مٹی سے ہے جس میں میرا لہو رچ گیا ہے

27 ستمبر 1965

چہرہ مسعود

مالک ، تیری اس دنیا میں ، آج ہماری زندگیوں کو کیسے کیسے دکھوں کا مان ملا ہے ،

ایسے دکھ جو ٹیسیں بھی ہیں ، دھیر بھی ہیں اور ڈھارس بھی ہیں
مالک ، آج اس دیس میں ، اس بستی میں، کوئی اگر دیکھے تو ہرسو
بھری بہاروں ، فصلوں ، کھلیانوں پرپھیلی دھوپ کی تہ کے تلے، اک
خون کے چھینٹوں والی چھینٹ کی میلی اور مٹیالی چادر بچھی ہوئی ہے
موت کی میلی اور مٹیالی موج میں ، رنگ لہو کے ، نقش لہو کے
ایک ایک چمکتی سطح کے نیچے ، راکھ لہو کی ، ساکھ لہو کی ،

کوئی اگر دیکھے تو آج اس دیس میں ، بانس کی باڑیں ،دھان کے کھیت میں ، ٹھنڈی ریت میں

جگہ جگہ پر بکھری ہوئی نورانی قبریں
آنگن آنگن روشن قدریں
مائیں ،——جن کے لال مقدّس مٹی
بہنیں——جن کے ویر منوّر یادیں
بالک——جن کی مایا ، بے سدھ آنسو

مرنے والے کیسے لوگ تھے ، ان کا سوگ بھی اک سنجوگ ہے ، اُن کا دکھ بھی ایک عبادت

کیسے لوگ تھے ، موت کی لہر پر ، آگ کی پینگ میں جُھولے ، تجھ کو نہ بھولے ، ہم کو نہ بھولے !

مالک ، ان کے صدہا چہرے——اک چہرہ ہیں ——پکی اینٹ کی رنگت والا چہرہ ،

روحوں کی دیوار میں ایک ہی چہرہ ، قبروں کی الواح میں ایک ہی چہرہ ،

مالک ، ہمیں بھی اس چہرے کے سارے کرب عطا کر

مالک اس چہرے کا سجرا سورج ، سدا ہماری زندگیوں میں ڈوب کے ابھرے !

اکتوبر 1965

یہ قصّہ حاصلِ جاں ہے ـــــــ

یہ قصہ حاصلِ جاں ہے اسی میں رنگ بھریں ،
لہو کی لہر کے لہجے میں اپنی بات کہیں ،

دھوئیں میں ، آگ کے تیشے میں ، زخم میں ، اب ہم
انہی کڑکتے دھماکوں سے اپنے گیت چنیں

ہمارے جیتے گھروندے ، ہمارے جلتے جتن
یہ مورچے ، یہ جیالے سپاہیوں کی صفیں

جلی زمین ، سیہ دھول ، صدقِ خوں کی مہک
قدم قدم پہ یہاں مہر و مہ کی سجدہ گہیں

یہ دن بھی کتنے مقدس ہیں ، بے بہا ہیں کہ آج
ہمارا حصہ بھی ہے طالع شہیداں میں

اسی تڑختی ہوئی باڑھ میں ، ہمیں کو ملیں
سنورتی ، سجتی ، نکھرتی ، دلوں کی اقلمیں

یہ جینے والے نے دیکھا ، کہ اس گروہ میں تھے
وہ جان ہار کہ جو موت کو بھی فتح کریں

میں ان کو طاق ابد سے اتار لایا ہوں
یہ شمعیں ، جن کی لویں میرے آنسوؤں میں جلیں

15 اکتوبر 1965

ہوس

کبھی تو وہ دن بھی تھے مگر، اب نجانے کیوں—دل سیاہ لہروں میں بہہ گیا ہے !

کبھی وہ دن بھی تھے———مگر———اب
زمین محور میں ، آسماں چوکھٹے میں ، ہر چیز اپنی اپنی حدوں میں محدود ،
اپنی اپنی بقا میں باقی
شعاعوں میں ، کروٹیں وہی تابشِ گہر کی ،
ہواؤں میں ، دھاریاں وہی سوجِ رنگِ زر کی ،

کہاں سے ڈھونڈوں وہ دن ، وہ دن ، جب
بدن پہ بے رنگ چیتھڑے تھے ،
جہت جہت میں الجھ گئی تھی ،
زمین——اک بے وجود نقطہ ،
جہان——اک رائیگاں صداقت ،
حیات——اک بے وفا حقیقت ،
عجیب دن تھے ، ہر ایک ذرے کے دل میں داغ فنا کا سورج ابھر رہا تھا
وہ دن ، وہ احساسِ بے ثباتی ،
وہ دولتِ بے زری ، وہ اپنی نمودِ بے سود میں غمِ لازوال کو ڈھونڈنے کی
خوشیاں

کہاں سے ڈھونڈھوں ، وہ دن کہ اب تو
ہوا کے ٹھنڈے غرور میں ہیں ہوس کے تیشے ،
ہوا کے تیشے ، جو طنز ہیں میری خود فراموشیوں ، مری بے لباسیوں پر
مرے بدن کو بھی اب تو درکار ہیں وہ ساماں
جو رزق‌سم ہیں ، جو مرگ دل ہیں

5 دسمبر 1965

افریشیا

دریا کے پانیوں سے بھری جھیل کے کنارے ،
آئے ہیں دور دور سے افریشیا کے پنچھی
اُجلے پروں کا بھاگ ہیں یہ رزق جُو اڑانیں !
اتنے سفر کے بعد——یہ تٹ ، یہ ذرا سا کھا جا ،
جوہڑ میں اک سڑی ہوئی پتّی——چھوں کا چوگا
اک گھونٹ زرد کیچ کا——مرغابیوں کا راتب
اور اس کے ساتھ ، گھات میں زد کارتوس کی بھی
چنگاریوں کے تیز تڑختے ہوئے تریڑے ،
اور——پانیوں پہ بہتی ہوئی سنسناہٹوں میں
لہراتے پنکھ ، ابھرتے کماندار ، زندہ ، چوکس
آزاد آبناؤں میں جیتے ہیں جینے والے
ٹھنڈی ہوا کی باس میں ، بارود کے دھوئیں میں ،

2 جنوری 1966

مسیحا

سدا لکھیں ،
انگلیاں یہ
لکھتی رہیں
لکھتی رہیں !

انگلیاں یہ
کاغذ پر
رکی ہوئیں

آنکھیں یہ
کاغذ پر
جمی ہوئیں

گہری سوچ
جذب عمیق

آنکھوں سے
روح تلک
پھیلی اک
دھیان دھنک !

آنکھیں ، سرخ ،
چپ ، خود سوز
ڈورے ، سرخ
لرزاں ، محو

سامنے اک
پارۂ جان
درد ہی درد
ٹیسیں ، کراہ
بو تلچھٹ
جر ثو مے

کوئی سبیل ؟
کچھ بھی نہیں
کوئی افق
کچھ بھی نہیں

آنکھیں—فکر
آنکھیں—صدق
آنکھیں—کشف !

ایک رمق ، لکھتی رہیں
ایک رمق ، لکھتی رہیں
اک یہ طریق
اک وہ اصول
یہ مشروب ،
وہ محلول ،
کچھ کیپسول
سطرِ شفا
حرفِ بقا

آنکھیں یہ ،
سدا جلیں
سدا جئیں ،
سکھ باٹیں ،
انگلیاں یہ ،
سدا لکھیں ،
لکھتی رہیں
سطرِ شفا
حرفِ بقا

3 فروری 1966

ننھے بچو

ننھے بچو، مجھ کو اب تک یاد ہے جب میں تمھاری عمر میں تھا
تب وہ لوگ جو مجھ سے بڑے تھے کتنے اچھے لوگ تھے،
سچے اور بھلے !
ننھے بچو، کل جب تم اس عمر میں ہوگے، میں جس عمر میں ہوں
تب وہ لوگ جو تم سے بڑے تھے،
کبھی کے مٹی اوڑھ کے سارے سو بھی چکے ہونگے
جانے تم اُس وقت ہمارے بارے میں کیا سوچو گے !
شاید وہ دن بڑے کٹھن ہوں پھر بھی اتنا کچھ تو یاد رکھوگے
کیسے لوگ تھے خود تو اپنے لہو میں ڈوب گئے
لیکن اس مٹی پر آنچ نہ آنے دی،
جس پر آج تمھاری آرزووں کے باغ سہکتے ہیں ————

20 اپریل 1966

جہاں نورد

سفر کی موج میں تھے ، وقت کے غبار میں تھے
وہ لوگ ، جو ابھی اس قریۂ بہار میں تھے

وہ ایک چہرے پہ بکھرے عجب عجب سے خیال
میں سوچا تو وہ غم میرے اختیار میں تھے

وہ ہونٹ جن میں تھا میٹھی سی ایک پیاس کا رس
میں جانتا تو وہ دریا مرے کنار میں تھے

مجھے خبر بھی نہ تھی اور اتفاق سے ، کل
میں اُس طرف سے جو گزرا ، وہ انتظار میں تھے

میں کچھ سمجھ نہ سکا ، میری زندگی کے وہ خواب
ان انکھڑیوں میں جو تیرے تھے کس شمار میں تھے

میں دیکھتا تھا وہ آئے بھی اور چلے بھی گئے
ابھی یہیں تھے ، ابھی گردِ روزگار میں تھے

میں دیکھتا تھا ، اچانک یہ آسماں ، یہ کرے
بس ایک پل کو رکے اور پھر مدار میں تھے

ہزار بھیس میں سیّار موسموں کے سفیر ،
تمام عمر مری روح کے دیار میں تھے

29 اپریل 1966

کون دیکھے گا ـــــــ

جو دن کبھی نہیں بیتا، وہ دن کب آئے گا،
انہی دنوں میں اُس اک دن کو کون دیکھے گا،
اُس ایک دن کو جو سورج کی راکھ میں غلطاں
انہی دنوں کی تہوں میں ہے، کون دیکھے گا،
اس ایک دن کو جو ہے عمر کے زوال کا دن
انہی دنوں میں نمویاب، کون دیکھے گا
یہ ایک سانس جھمیلوں بھری، جگوں میں رچی
اس اپنی سانس میں انت اپنا کون دیکھے گا،
اس اپنی مٹی میں، جو کچھ اسٹ ہے مٹی ہے
جو دن اِن آنکھوں نے دیکھا ہے، کون دیکھے گا،
میں روز ادھر سے گزرتا ہوں، کون دیکھتا ہے
میں جب ادھر سے نہ گزروں گا، کون دیکھے گا
دو رویہ ساحلِ دیوار، اور پسِ دیوار
اک آئینوں کا سمندر ہے، کون دیکھے گا
ہزار چہرے خود آرا ہیں کون جھانکے گا
مرے نہ ہونے کی ہونی کو کون دیکھے گا
تڑخ کے گرد کی تہ سے اگر کہیں کچھ پھول
کھلے بھی ـــــ کوئی تو دیکھیگا! کون دیکھے گا

3 جون 1966

حضرت زینب

وہ قتل گاہ ، وہ لاشے ، وہ بے کسوں کے خیام
وہ شب ، وہ سینۂ کونین میں غموں کے خیام

وہ رات ، جب تری آنکھوں کے سامنے لرزے
مَرے ہوؤں کی صفوں میں ڈرے ہوؤں کے خیام

یہ کون جان سکے ، تیرے دل پہ کیا گزری
لٹے جب آ گ کی آندھی میں غم زدوں کے خیام

ستم کی رات کی کالی قنات کے پیچھے
بڑے ہی خیمۂ دل میں تھے عشرتوں کے خیام

تری ہی برقِ صدا کی کڑک سے کانپ گئے
یہ زہرِ چترِ مطلّا شہنشہوں کے خیام

جہاں پہ سایہ کناں ہے ترے شرف کی ردا
اُکھڑ چکے ہیں ترے خیمہ آنگنوں کے خیام

1966

غزل

اک عمر دل کی گھات سے تجھ پر نگاہ کی
تجھ پر — تیری نگاہ سے چھپ کر نگاہ کی

روحوں میں جلتی آگ خیالوں میں کھلتے پُھول
ساری صداقتیں کِسی کافر نگاہ کی

جب بھی غمِ زمانہ سے آنکھیں ہوئیں دوچار
منہ پھیر کر تبسّمِ دل پر نگاہ کی

باگیں کھنچیں، مسافتیں کڑکیں، فرس رکے
ماضی کی رتھ سے کس نے پلٹ کر نِگاہ کی

دونوں کا ربط ہے تیری موجِ خرام سے
لغزش خیال کی ہو کہ ٹھوکر نِگاہ کی

1960

ایرپورٹ تے

میدان ہوائی جہازاں دے اساں وچ قطاراں ، ڈھئی
سو سو بتّی بالدی کائی رتی تے کائی چٹّی
اُڈدے آون تے اُڈدے جاون، کونجاں وانگ کھٹولے
جنہاں ڈھٹی ست اسماناں دی ہر گُجھل تھاں ان، ڈھئی
لکّھاں رنگ برنگے بھیساں وچ پئے پھردے ہسدے ٹولے
جنہاں ہسدیاں ہسدیاں تروڑلئی ساڈے دل دی کِھڑدی سٹّی
تیری رہ وچ پندھ پہاڑاں دے، تیرے کھمباں ہیٹھ سمندر
اُڈدیئے کونجے لے چل ساڈی درد فراق دی چِٹھی
جا آکھیں دوردے دیساں دے وسنیکاں نوں جا آکھیں
تسیں بدلاں دے وچ وسدے اسیں مٹّی دے وچ مٹّی

روز ، اس مسلخ میں کٹتا ہے ، ڈھیروں گوشت
دھرتی کے اس تھال میں ، ڈھیروں گوشت
اور پھر یہ سب ماس
چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں
بستی بستی گلیوں اور بازاروں میں
لمبی لمبی قطاروں میں
جدا جدا تقدیروں میں
بٹتا جاتا ہے—
ہر ٹکڑے کی اپنی آنکھیں ، اپنا جسم اور اپنی روح
کہنے کو تو ہر ٹکڑے کا اپنا اپنا نام بھی ہے ،
اپنا اپنا دیس بھی ہے
اپنی اپنی اُمنگیں بھی
—لیکن کچھ بھی ہو
آخر یہ سب کچھ کیا ہے
ڈھیروں گوشت !
کھالیں بھیجے انتڑیاں
یہ سب خود آگاہ ، جیالے لوگ
میں نے آج جنھیں اس برسوں پہلے کی تصویر میں دیکھا ہے
یہ سب جسم ،
جیتے ریشوں کے کَس بل میں سنبھالے ہوئے یہ دھڑ
آج کہاں ہیں—یہ سب لوگ
اب تو ان کی بُو تک بھی
شہرِ ابد کے تہ خانوں سے نہیں آتی
باقی کیا ہے،—صرف
سورج کی اک چنگاری—
اور اس چنگاری کے دل میں دھڑکنے والی کلی

جس کی ہر پتّی کا ماس

فرد——— !

عصر——— !

حیات——— !

28 مارچ 1968

اُس دن ، اس برفیلی تیز ہوا کے سامنے مَیں کچھ پہلے سے بھی زیادہ بوڑھا
سا لگتا تھا
شاید ، واقعی اتنے ترس کے قابل ہی تھا
اس دن ، تم نے مجھ سے کہا تھا
اک دن میرے لئے تم اس دنیا کو بدل دوگی ، یہ تم نے کہا تھا

اس دن بھری سڑک پر ، تم نے پیڈل روک کے
اپنے بائیسکل کو میرے بائیسکل کے ساتھ ساتھ چلا کر ، مجھ سے کہا تھا :
" آپ ایسے لوگوں کو بھی روز یہاں پتھر ڈھونے پڑتے ہیں ، روٹی کے
ٹکڑے کی خاطر—"
تھوڑی دور تک ، بھری سڑک پر ، دو پہیّوں کے ساتھ وہ دو پہیے
ڈولے تھے ،
دندانوں میں ٹِک ٹِک کتّے بولے تھے ، سب دنیا نے دیکھا تھا ،

اور اس دن میں نے اپنے دل میں سوچا تھا ،
"کیسا شہر ہے یہ بھی ،...ایسی ایسی باغی روحیں بھی اس میں
بستی ہیں—"

میں تو اسی تمہارے شہر میں اب بھی روز اِک میز پہ پتھر ڈھونے
جاتا ہوں ، کاغذ کے پتھر
لیکن جانے تم اب کہاں ہو ، اے ری گول مٹول سیانی گڑیا
بیٹی ، شاید تم تو کہیں کسی دہلیز پہ دو منقوط گلابی گال آنکھوں سے
لگا کر
نئی سفید جرابوں والے کسی کے ننّھے سے پیروں میں گرگابی کے تسمے کسنے
بیٹھ گئیں ،—اور
یہاں ، ادھر اب ، ساتھ ساتھ جڑے ہوئے میزوں کی اک لمبی پڑی بچھ بھی
چکی ہے ، حدِ زمیں تک

ظلم کے ٹھیلے روز اس پٹڑی پر ، بے بس زندگیوں کو دور افق کے گڑھے میں ڈھونے آتے ہیں

اور میں اب بھی تمہارے کہنے پر
اس پٹڑی کے اک تختے پر
عمروں کی گنتی کے چھٹے دہے پر
اُس دنیا کا رستہ دیکھ رہا ہوں ، جس میں تمہارے نازک دل کی مقدّس سچّائی کا حوالہ بھی تھا
جانے پھر تم کب گزروگی ادھر سے—اس دنیا کو ساتھ لئے—،

28 مئی 1968

دنیا میرے لیئے تھی............

دنیا مرے لیئے تھی اک بے مصرف مصروفیت
جیسے تھا ہی نہیں میں اس دنیا میں

جیسے موت مرے جی میں جینے آئی ہو

پھر جب ان کے کرم سے ان کا نام مرے ہونٹوں پر آیا

سارا زمانہ ، سب تقدیریں دنیائیں اور چاند ستارے

سب کچھ تھا بس ایک تموج ، لہریں
میں جن میں بہتا تھا ،
لہریں جو میرے جی میں بہتی تھیں ،
میں تو اس قابل بھی نہیں تھا—
یہ سب ان کا کرم تھا
وہ مجھ کو یاد آئے تھے ،
میں نے اُن کو یاد کیا تھا

20 جون 1968

مجھ سے روز یہی کہتا ہے ، پکّی سڑک پر وہ کالا سا داغ ، جو کچھ دن پہلے
سرخ لہو کا اک چھینٹا ، چکنا گیلا چمکیلا چمکیلا
مٹی اس پہ گری اور سیلی سی اک پپڑی اُس پر سے اتری اور پھر
سیندھوری سا اک خاکہ اُبھرا
جو اب پکّی سڑک پر کالا سا دھبہ ہے، پسی ہوئی بجری میں جذب اور جامد—
آن مٹ ،

مجھ سے روز یہی کہتا ہے ، پکّی سڑک پر مسلا ہوا وہ داغ لہو کا :
"میں نے تو پہلی بار اس دن ، اپنی رنگ برنگی قاشوں والی گیند کے پیچھے
یونہی ذرا اک جست بھری تھی
ابھی تو میرا روغن بھی کچّا تھا—
اس مٹی پر مجھ کو انڈیل دیا یوں کس نے ،
اُوں اُوں—میں نہیں مٹتا ، میں تو ہوں—اب بھی ہوں—"

میں یہ سن کر ڈر جاتا ہوں
کالی بجری کے روغن میں ، جینے والے اس معصوم لہو کی کون سنے گا
سمتا ِبک بھی چکی ہے چند ٹکوں میں
قانون آنکھیں میچے ہوئے ہے
قاتل پہیے بے پہرا ہیں

21 جولائی 1968

اپنی آنکھ پہ پٹّی........

اپنی آنکھ پہ پٹّی باندھ کے دیکھو ،
اپنی اوٹ سے اپنے آپ کو دیکھو ،
اندھیارے میں سوچو ،
کسی کے ٹھنڈے ، مشفق ، حکمت والے ہاتھ تھے ، جن میں
ٹھنڈی ، تیز ، کٹیلی ، دھار تھی دکھ کی ،
چرتی جلد سے گرتی ، انگارہ سی ، بوندیں ،
یہ اک ، سانس تو شاید—
اس اک رکتی ، رستی سانس کے بعد تو شاید—
میلی گیلی کا فوری مٹّی کا بچھونا—
اسی بچھونے سے میں اٹھا ،
سدا جئیں وہ ٹھنڈے ہاتھ ، جنھوں نے پٹّی باندھی ،
اب آنکھوں پر پٹی باندھ کے دیکھا ، یہ دنیا کتنی اچھی ہے ،
تنہا بیٹھ کے سوچا
اس اک اتنی اچھی دنیا میں بھی
کون ادھر کو میری جانب دیکھے گا
جب تک میری آنکھوں پر پٹّی ہے ،

11 جولائی 1968

یہ سب دن
تنہا ، نا یکسُو
یہ سب الجھاوے ،
کالی خوشیاں ، کالے غم ،
اے رے دل !
رہا ہے تو اب تک
کن بھگتانوں میں !

اور اب بھی تو آگے ہے
ایک وہی گذران دنوں کی ، جس کی رو
جذبوں اور خیالوں میں چکراتی ہے
ہم جیتے ہیں ، ان روحوں کو بھلانے میں
سدا جو ہم کو یاد کریں ،
سدا جو ہم کو اپنے مشبک غرفوں سے دیکھیں
جیسے پورب کی دیوار پہ ، انگوروں کی بیلوں میں ،
بڑھتے ، رکتے ، ننھے ننھے ، چمکیلے نقطے
کرنوں کے ریزے
جو ہر صبح کو ،
ہر جھونکے کے ساتھ ،
ان پتّوں کی درزوں میں ،
اے رے دل ،
تیری خاطر ، جلتے بجھتے ہیں !

کس کی خاطر ؟—یہ اک صبح !
کس کی خاطر ؟—آج کا یہ دن !

کیسا دن ؟
یہاں تو ہے بس ایک وہی اندھیر دنوں کا جس کی رو
روحوں میں اور جسموں میں چکراتی ہے

5 اگست 1968

تُو ہے لاکھوں کنکریوں کے باہم پیوست دلوں کا طلسم ،
تیرے لئے ہیں ٹھنڈی ہوائیں ، اُن بے داغ دیاروں کی
جن پر پیارے ، سرخ ، سنہرے دنوں کی حکومت ہے
ایک یہی رفعت ،
تیرے وجود کی قدر بھی ہے اور قوّت بھی
تیرا وجود جو اس پاتال سے لے کر اُوپر کی اُن نیلی حدوں تک ہے
تو اِس اونچی مسند پر سے جھک کر دیکھ نہیں سکتا

لیکن اس پاتال کے پاس ، جہاں میں ہوں
بڑا ہی گدلا اور کسیلا—کالی مٹّی والا—پانی ہے
زہر کدوں سے آنے والی ندیوں کا پانی
جس کی دھار تری پتھریلی دیواروں سے جب ٹکراتی ہے
تو میرے سینے میں دل کی ٹوٹی کنکری ڈوبنے لگتی ہے ،

اے رے اونچی مسند والے پہاڑ
کبھی تو اپنی خاطر میری سمت بھی جھک کر دیکھ

8 اگست 1968

ڈر کاہے کا ،
جتنا زور تمہارے خیال کی رُو سے تمہارے بدن میں ہے، وہ سارا زور لگا کر
(اور تمہاری صحت بھی تو خیر سے امڈی پڑتی ہے نا)
اپنے سارے بدن کا زور لگا کر
چھینو—اِس سے ، حصہ اس کے روزینے کا ،
اس سے ، ہر عکس اُس کے آئینے کا ،
سب سے ، حق جینے کا ،

ڈر کاہے کا ،
گرجو ، اور کالے رسّوں کی گرہیں کھل جائیں گی ،
بپھرو ، اور جابر ہاتھوں کی ریکھائیں گھل گھل جائیں گی ،
جھپٹو ، اور سب قدریں اک میزان میں تل جائیں گی ،
یوں بھی نہ مقصد حاصل ہو تو پھر کیا ،
دیکھو، تمہارے گٹھیلے جثے میں ہے ذہن کی جتنی طاقت، اس کو کام میں لاؤ
اس اک حرف کو دیکھو، شکل ہے جس کی اک زنجیر کی صورت
بھرے کٹھرے میں تم میز پر مکّہ مار کے کہہ دو
"یہ اک حرف تو اس پستک میں نہیں کہیں بھی
پستک جس کے سب حرف اور سب سطریں سیدھی ہیں"
تم دیکھو گے، ترازو کا وہ پلڑا جس میں تم ہو تمہاری جانب جھک جائیگا،

رہ گئی اک یہ مقدّس مٹّی ، ہم ہیں تو ہیں اس کے ریزہ چیں ،

ہم اس کی خاطر جی لینگے ، ہم اس کی خاطر مر لینگے

15 اگست 1968

اب وہ لوگ جنھوں نے میرے بیٹوں کا — خون پیا —
میرے بیٹے تو سب اُن کے بھائی تھے — ،)
اپنے وہ لوگ جنھوں نے میرے حصے کے روزینے کو — اپنے جبڑوں میں —
— بانٹ لیا ،

اب وہ اپنے دل میں سمجھتے ہیں ، — دنیا ان کی ہے —
لیکن کبھی اگر وہ دیکھیں تو — میری باہیں نہیں تھکتیں —
کبھی اگر وہ دیکھیں تو —
اُن کے انہی قدموں کے تلے — میرے الگ الگ دو ہاتھوں کی اک باہم جڑی
ہوئی مضبوط ہتھیلی ہے — ،
اسی ہتھیلی پر ہے اُن کا سب تن و توش — ،
وہ اپنے قدموں کی طرف اک مرتبہ دیکھیں — تو —
انہیں وہ سنگھٹ بھی نظر آئے جو — ان کے ہاتھوں کے قطع کے در پے ہے — ،

لیکن وہ دیکھتے ہیں اُوپر اُوپر — اُس آکاش کی سمت —
وہ آکاش جو ان کی کھوپڑیوں کے نیچے نیلے رنگ کی چربی ہے —
کس سے کہوں میں : یہ میرے بیٹے بھی کیسے ہیں

بندے ، جب مٹّی کے اندر بھر جاتا ہے
لہو کا دھارا ،
پھر جب آنکھیں روح کی ٹھنڈی سطح کو چُھو کر دیکھتی ہیں دنیا کو ،
پھر جب یوں لگتا ہے ، جیسے
اس پنڈے میں کھلی ہے سارے دیس کی سرسوں ،
پھر جب باہیں ٹیڑھی ہو کر جھولتی ہیں چلنے میں ،
پھر جب نفرت ایک ادھورے پیار سے دیکھ کے ،
ہنستی ہے اُن پر ،—وہ جو جن کی سچّی سوچیں چلّہ کش رہتی ہیں
پھر جب دل کہتا ہے : "اے رے کر جوے ، آج ہمارے لیئے تم
کتنے کرمنڈل بھیجو گے امرت کے"
تب ایسے میں کون یہ جانے ، بندے
کون اس بھید کو پائے ، بندے
کون یہ دیکھے—لہو کی لہر کا سب روغن تو
اُس بھوجن کا رس ہے ،
وہ بھوجن جو کوڑا کرکٹ ہے اور جس کو کتّے بھی نہیں کھاتے

11 اگست 1968

سب اس گھاٹ پہ اک جیسے ہیں ،
جب سے نیل گگن کی ٹینکی سے پانی برسا ہے
جب سے سات سمندر سات بھرے ہوئے ٹب پانی کے
اس آنگن میں رکھے ہیں ،
پہلے بھی سب لوگ اس گھاٹ پہ اک جیسے تھے ،
اور—اب بھی ، اس کالے نل میں ، جب سے
کھٹ سے کھچ کر آنے والا پانی
چھک سے گرنے لگا ہے ،
چکنی اینٹوں والے گھاٹ پہ سارے خدا اور سارے فرشتے اورسب روحیں
اپنے غرور کی اس پھسلن میں اک جیسی ہیں ،

اے رے شہرِ ابد کے واٹر ورکس کے رکھیا
دلوں کی صد رخ نلکی میں اپنی سطحیں ہموار نہ رکھ سکنے والے سب پانی
سارے مقدّس پانی
کس طرح تیرے نیلے تالابوں میں آکر یکسُو ہو جاتے ہیں

اگست 1968

اک اک روح کے آگے اک دیوار ہے اونچی گلے گلے تک ،
اک دیوار ہے رمزِ دروں کی
اس دیوار کے اندر کی جانب جتنا کچھ بھی ہوتا ہے جس کے پاس خزانہ ،
اک 'دردانہ ، یا اک تال مکھانہ
نقدِ باطن یا کم از کم—آب و دانہ ،
جتنا کچھ بھی پاس ہو اتنی ہی دیوار یہ موٹی ہوتی ہے اور اس دوری کے باعث
اتنی ہی اس روح کی بات ذرا گھمبیر اور گہری ہو جاتی ہے
اپنے بوجھ سے بوجھل ہو جاتی ہے
دیر سے سننے میں آتی ہے ،
اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے ، روح نہ اُس کا کوئی دھندا ،
اپنے پاس تو صرف اک یہ آواز ہے جس کے آگے کوئی بھی دیوار نہیں ہے
سن سے تمہارے پاس پہنچ جاتی ہے
اس آواز میں رمزِ دروں کے سارے غیر مقطّر زہر ہیں ، اس کا برا نہ مانو ،
کبھی کبھی جی میں آئے تو ، سن لو
چن لو
رکھ لو
چکھ لو

4 ستمبر 1968

تاروں بھرے دریاؤں جیسی—لمبی تانوں والا یہ نغمہ—
دور پہاڑوں میں چکراتی ہواؤں جیسی—پہچان سی یہ لَے—
اب بھی جس کی گونج میں ایک مقدّس دکھ کا بلا وا ہے—

میں جب بھی یہ گانا سنتا ہوں ،
مجھ کو یاد آجاتے ہیں وہ لوگ ،
جن کے لئے اس دن، اُس آگ کی آندھی میں یہ بول ہماری یادیں لیکر آئے تھے،
مجھ کو یاد آجاتے ہیں وہ لوگ، جنہوں نے اُس دن ، اتنے دھماکوں میں ،
ان شبدوں کو سنا ،
اور ہمارے بارے میں سوچا ،
جو کچھ سوچا—کر گزرے ،
اُن کی انہی سوچوں کی دین ہیں یہ سب دن ، ہم جن میں جیتے ہیں ،
جن میں جئیں گے آنے والے جینے والے بھی ،

انہی دنوں کا سر گم میرے دل کی سپتک پر چھڑ جاتا ہے ،
جب بھی میں یہ گانا سنتا ہوں—

6 ستمبر 1968

پھر جب دوستیوں کے سمندر میں........

پھر جب دوستیوں کے سمندر میں دم سادھ کے اُترے
اور لمبے گہرے ، بے سدھ ، غوطے کے بعد ابھرے
اپنے دل کا خزف بھی اپنے پاس نہ تھا
باہر دیکھا—باہر کوئی اور ہی دیس تھا
باہر—کیسا بازو دار ، لہکتا جنگل تھا
جنگل دوستیوں کا—
مشفق اجنبیوں کی طرح ہماری جانب دیکھنے والے چہرے دوستیوں کے

جی نے چاہا ، اب تو باقی عمر اسی جنگل میں پھول چنیں گے—
جانے کتنے دن یوں جاگ سکیں گے اس سے پہلے کہ اپنے دل کا سوکھا
پتّا ٹوٹ گرے

7 ستمبر 1968

اتنے بڑے نظام میں صرف اک میری ہی نیکی سے کیا ہوتا ہے
میں تو اِس سے زیادہ کر ہی کیا سکتا ہوں ،
میز پر اپنی ساری دنیا
کاغذ اور قلم اور ٹوٹی پھوٹی نظمیں ،
ساری چیزیں ،
بڑے قرینے سے رکھ دی ہیں ،
دل میں بھری ہوئی ہیں اتنی اچھی باتیں......
ان باتوں کا دھیان آتا ہے تو یہ سانس بڑی ہی بیش بہا لگتی ہے
مجھ کو بھی تو کیسی کیسی باتوں سے راحت ملتی ہے ،
مجھ کو اس راحت میں صادق پا کر سارے جھوٹ مری تصدیق کو آجاتے ہیں

ایک اگر میں سچّا ہوتا
میری اس دنیا میں جتنے قرینے سجے ہوئے ہیں
ان کی جگہ بے ترتیبی سے پڑے ہوئے کچھ ٹکڑے ہوتے
میرے جسم کے ٹکڑے—کالے جھوٹ کے اِس چلتے آرے کے نیچے ،

اتنے بڑے نظام سے میری اک نیکی ٹکرا سکتی تھی
اگر اک میں ہی سچّا ہوتا

8 ستمبر 1968

کبھی کبھی وہ لوگ بھی جن کا ناؤں لکھا ہے
کتنے سوضعوں کے پٹواریوں کی کھیوٹ ہیں ،
میرے دل کے اندر بیٹھ کے میری باتوں کو سنتے ہیں
پیار سے مجھ کو دیکھتے ہیں یوں جیسے اس گودام میں کاغذ چاٹنے والا اک کیڑا ہوں

مجھے خبر ہے ، دشمن اکثر غرّانے سے پہلے سمیاتا ہے
لیکن میرا جی نہیں ڈرتا
مجھ پہ جھپٹ کر مجھ سے آخر وہ چھینیں گے بھی کیا
اپنے پاس کوئی رجواڑہ لالچ کا نہیں ہے ،
اک دو حرف ہیں جن کی گرمی میرے لہو میں لہراتی ہے
ان لوگوں کی ریڑھ کی نلکی میں ہے گودا بھی سونے کا
کوئی کیسا ریلا آئے ،
ان کا پشتیبان وہ پشتہ بہ نہیں سکتا ، جس کے ذرّے آبِ زر سے جُڑے ہیں
اے وہ ، اپنے دوام کو جس نے حرف کے پیرائے میں دیکھا ،
تیرے سپرد ہیں میرے ٹوٹے پھوٹے ،مٹّی کے، یہ شبد کہ جن میں میری مٹّی کی روزی ہے

11 ستمبر 1968

رات ، اچانک پھاٹک کا اک پہیّہ رینگا
پگڈنڈی پر اک آہٹ نے ٹھوکر کھائی ،

کالے کالے پروں کو اوڑھ کے سونے والی وحشت
پاس کے پیڑ پہ، کندے جھٹک کر چونکی ، چیخی
جیسے کوئی اس کی طرف جھپٹا ہو ،
ڈرتے ڈرتے اس نے نیچے اندھیارے میں جھانکا

" اوہو......یہ تو ایک وہی سایا ہے
وہ جو روشنیوں کے پہلے پھیرے سے بھی پہلے
روز ادھر سے گزرتا ہے اور پہلی پینگ کے پڑنے سے بھی پہلے
چلتا چلتا اس باڑی میں کھو جاتا ہے......
آج تو جانے کس لرزاں دھبّے سے ٹکرایا وہ !.. پگلا ! "

کوئل نے یہ سوچا ، پھر بے کھٹکے
پتوں کی اس سیج پہ تھوڑی دیر کو اونگھ گئی وہ
بوئے سحر کے مست بلاوے پر بے ساختہ کُوک اٹھنے سے پہلے

14 ستمبر 1968

گوشت کی چادر

گوشت کی چادر لچکی ، اس پر اک دو ترچھے شکن پڑے
بیل اب اس نالے سے باہر تھا

اس کے لوہے کے بازو ، اور شانے اور صاف، سفید سی ، کھال
اور وہ خم کھائے ہوئے سینگ
اور وہ جثہ جیسے گوشت کی چادر
اور وہ اس کا وجود......
بے پندار
بے پرواہ
ہل کا اہل
جیوٹ اور مگن

جانے کب سے ، جب سے کالی دھرتی پر ،
جیتے گوشت کی یہ چادر لچکی ہے
انسانوں نے سکھ کی فصلیں کاٹی ہیں

17 ستمبر 1968

اسی کُرے کے جوف سے تم نے کشید کیا،
انگاروں سے بھرا ہوا سیّال غرور،
لیکن کس کی تھی یہ مٹی—ہم سب کی،
اس مٹّی کی وریدوں سے یہ کھچا ہوا سیّال غرور
سب میں بٹ جاتا
تو یہ دیس دلوں کے سجدوں سے بس بس جاتا
ہم نے بجھتے بھڑکتے ان انگاروں کو
اپنی روح میں بویا—اور نفرت کاٹی
ان انگاروں پر تم نے اپنے چہرے ڈھالے ٹکسالوں میں
مقصد لوہے اور فولاد کا یہ جنگل تو نہیں تھا
ہونے کو تو جس کی اک اک دھڑکن میں
تہذیبیں ہیں

کیسی تہذیبیں......جب اک لرزش گہری ہو کر اتریگی سنگین چٹانوں میں
اور دھوئیں میں تیریں گی بے جان مقرّض قاشیں دنیا کی
تب بھی صرف اک شے باقی رہ جائے گی
تم محسوس کرو تو آج بھی اس کا بوجھ تمہارے دل پر ہے

17 ستمبر 1968

(پس منظر : ستمبر 68 کا سورج گرہن ، جب روس کے سپٹنک نے
چاند کے مدار پر گردش کی)

بھائی ، اتنی جلدی کیا تھی.....
دن ڈھلتے ہی ہم تو دور نگر چشمے اپنی آنکھوں سے لگا کر بیٹھ گئے تھے ،
دیکھیں ، کب سورج کے تھال پہ آکر
ٹھہرے ، تھوڑی دیر کو ، کالے چاند کا لرزاں دھبا ،

ہم یہ آس لگائے بیٹھے تھے ، دیکھیں کب چاند کے گرد اچانک
چک چک چکراتا گزرے وہ چھوٹا سا اک رکشا
سورج کے گول کنارے کی پٹڑی پر چلتا ، گہن سے اوجھل ہوتا ،
چکر کاٹ کے سامنے آتا ، دور سے دِکھتا ، رکشا

دل ہی دل میں ہم کہتے تھے ، دیکھیں کیسا ہو یہ تماشہ
وہ سورج کی آنکھ، اور اس میں چاند اک کالی پتلی ، اور پھر اُس پتلی
کے گرد لڑھکتا ، اک وہ سایا ،
پھر یہ سب کچھ ، عکس بہ عکس ہماری آنکھ کی پتلی میں بھی ،
اک پل کے محور پر گھومنے والے تین کُرے ،—او ہو اب تو آنکھیں
بھی دُکھتی ہیں ،
اے لو ، سورج پر سے ڈھل بھی گیا وہ سایا—لیکن تم نہیں آئے ،

سنا ہے ، تم تو اک دن پہلے کسی سدیمی دوری کے نزدیک خلا میں ،
وہیں کہیں تھے ، اپنے چکراتے رکشا پر ،
جانے اک دن پہلے ہی تم ، کیوں لوٹ آئے ، بھائی اتنی جلدی کیا تھی.....
دیکھیں ، گردشِ دوراں کے دوران ، تمہاری سواری پھر کب گزرے ،
ان راہوں سے ،

ایسے میں ، جب ہوں اک سیدھ میں تین کرے اور تین زمانے—
اُس دن ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے ، اور اس دن ہم تو لوگوں کا کہا مانیں گے—

24 ستمبر 1968

مریض کی دعا

کل تک تو یہ دنیا میرے لیئے اک آئینہ تھی ،
جس میں میری نخوت آنے والے کل کا یقینی چہرہ دیکھ کے اِتراتی تھی،

تُو تو سب کچھ جاننے والا ہے ، میں کتنا خویش غرض تھا ،
اب تک جب بھی تجھ کو یاد کیا ہے
اپنی نخوت کی اس بھول میں تم کو یاد کیا ہے ،

لیکن آج مجھے اس بات کا ڈر ہے ،
کل جب آنے والا کل آئے گا
میرے بے حِس سرد مساموں کو وہ روشنیاں ،—اک
ڈھیلے ٹاٹ کے جھول میں—میرے جسم پہ شاید جیتے دنوں کی آخری کرنیں ہوں گی !

آج مرا یہ عہد ہے تجھ سے ،
کل کو—آنے والے کل کے بعد—اگر کچھ دن بھی میرے لیئے ہیں ،
تو مرا اک اک دن اس دن کی اطاعت میں گزرے گا ،
تیرے خزانوں میں جو میرے سمیت سبھی کے لئے ہے اور کسی کے لئے بھی نہیں ہے
تیرے عیب میں تو سب کچھ حاضر ہے
کل کے بعد بھی مرے ارادوں کو توفیق کے دن دے ،
اے وہ جس کے آج میں فرداؤں کے ابد ہیں

30 ستمبر 1968

وہ بھی اک کیا نام ہے جو ہر دم ہے......!

ہم ہیں......اور نہیں ہیں
ہم اور باقی جو کچھ بھی ہے ، اُس کا ہونا اس کے نہ ہونے کی خاطر ہے
پھر اس اک اک ہونی کا ہے جدا جدا اک نام بھی اپنا
اپنے اپنے نام ہیں چیزوں کے اور آدمیوں کے
اک اک نام کے جسم ہیں یہ سب چیزیں
نام اِن جسموں میں جیتے ہیں
نام ان جسموں میں بے جسم ہیں اور جیتے ہیں
آج تو میں نے دیکھا میرے جسم میں میرا نام نہیں تھا
جیسے اک احساس کی زد سے
مجھ میں میرا باطن ڈوب چلا ہو ،
ایسے میں ، اس میرے نام سے خالی ہونے والے خلا میں
جب اک نام نے جھانکا......جانے کس کے نام نے جھانکا
پھر سے ، مرے قدموں کے نیچے
میرے باطن کی مٹّی تھی ،
میرے باطن کی یہ مٹّی ، میرے نام کی جس سے نمو ہے ،
کیسا ہے یہ نام کہ جو ہر دم ہے ،
ہم ہی نہیں اس نام سے نامی ،

7 اکتوبر 1968

دن تو جیسے بھی ہوں ،—آخر اک دن
دنوں کی اک اک سچائی کو جھوٹ کے تیشے مقرّض کردیتے ہیں

دیکھو—سوچو—
دل کی اس پیچاک میں ہیں جو شکنجے وہ تو ویسے ہی تھے
اس پیچاک سے نچڑا ہوا وہ گیہوں ، جَو ، زیتون کا رس تو ویسا ہی تھا
جسموں کی سب کار گہیں تو ویسی ہی تھیں ،
جب یہ سر فرعونوں کے آگے جھکتے تھے ، تب بھی
جب اک گورا پلٹن اس سنگھاسن پر پہرا دیتی تھی ، تب بھی
اور اب بھی جب ہم نے مستقبل کا سارا بوجھ اپنے شانوں پر بانٹ لیا ہے ،
گورا پلٹن کی سنگینوں کے سائے میں بھی بھوجن ملتا تھا ،

فرعونوں کی خدائی میں بھی بندے پتل بھات سے بھر لیتے تھے ،
اور اب اپنے گھروں میں ہم ہر اک مثلّج آسائش رکھتے ہیں
تو کیا صرف ہمیں سچے ہیں ؟
کیا وہ سب جھوٹے تھے ؟

یوں تو آج ہم اُن پہ ترس کھاتے ہیں ،
جن کی پتھر ڈھوتی عاجزیاں فرعونوں کے چابک کھاتی تھیں ،
لیکن کیا اس بات کی ان کو خبر تھی......
کیا اس بات کی ہم کو خبر ہے......
اس دنیا میں جو کچھ بھی ہے ، اس کا حاصل تو وہ سچّائی ہے ، جس کو
آخر جھوٹ کے تیشے مقرّض کردیتے ہیں

پھر کیوں یہ سب دریا، چہروں کھوپڑیوں کے دریا، اِن گلیوں میں بہتے ہیں،
شہرِ ازل کے اونچے پل کی کھڑی ڈھلان سے لے کر

ان گلیوں ، ان دہلیزوں تک بہتے ، آتے ، دریا
دریا ، جن پہ شکن ہے—چھاپ لہو کی ،
لہریں ، جن پہ بھنور ہیں—لہو کی سہریں
آخر اس ریلے میں کون اچھا تھا ،——
آخر سچ کے تٹ پر کون اُترا ہے......؟

اپنی آنکھوں میں یوں کانٹے بھر کر میری جانب مت دیکھو—میں سچ
کہتا ہوں ،
سوچو ، آخر سچ کے تٹ پر کون اُترا ہے......!

12 اکتوبر 1968

آج تم ان گلیوں کے اُکھڑے اُکھڑے فرشوں پر چلتے ہو ،
بچّو ، آؤ تمہیں سنائیں گذرے ہوئے برسوں کی سہانی جنوریوں کی کہانی
تب یہ فرش نئے تھے !

صبح کو لمبے لمبے اوور کوٹ پہن کر لوگ گلی میں ٹہلنے آتے
ان کے پراٹھوں جیسے چہرے ہماری جانب جھکتے
لیکن ہم تو باتیں کرتے رہتے اور چلتے رہتے ،
پھر وہ ٹہلتے ٹہلتے ہمارے پاس آجاتے ،
بڑے تصنّع سے ہنستے اور کہتے : " ننھو ، سردی تمہیں نہیں لگتی کیا ! "
ہم سب بھرے بھرے جزدان سنبھالے ، لوحیں ہاتھوں میں لٹکائے ،
بنا بٹن کے گریبانوں کے پلو اُدھڑے کاجوں میں اٹکائے ،
تیز ہواؤں کی ٹھنڈک اپنی آنکھوں میں بھر کر ،
چلتے چلتے، تن کے کہتے: "نہیں تو کیسی سردی، ہم کو تو نہیں لگتی !"

بچّو ، ہم ان اینٹوں کے ہم عمر ہیں جن پر تم چلتے ہو ،
صبح کی ٹھنڈی دھوپ میں بہتی آج تمہاری اک اک صف کی وردی
ایک نئی تقدیر کا پہناوا ہے ،

اجلے اجلے پھولوں کی پلٹن میں چلنے والو ،
تمہیں خبر ہے ، اس فٹ پاتھ پہ تم کو دیکھنے والے اب وہ لوگ ہیں
جن کا بچپن اُن خوابوں میں گذرا تھا جو آج تمہاری زندگیاں ہیں ،

19 اکتوبر 1968

ٹیڑھے مُنہ اور کالی باتیں
کانٹے بھرے ہوئے آنکھوں میں
یہ دنیا، یہ دنیا والے
تو مت جا اس اور، باگیں موڑ بھی لے،

دلوں کی اس "دلدل" کے کنارے
رُوپ گھمنڈ کے پتلے سارے
اک پر، دوسرا، کیچ اُچھالے،
اس تٹ پرمت ڈول، باگیں موڑ بھی لے،

آگے بس کی لہر ہے، جل تھل
کسی کی بابت، ماتھے پر بل،
اے رے دُکھے ہوئے دل والے،
یوں مت، یوں مت سوچ، باگیں موڑ بھی لے،

25 اکتوبر 1968

لوگ یہ گھری نپی تلی تدبیروں والے ،
جانے ان لوگوں کو کیا ہے......
کبھی کبھی یوں دیکھتے ہیں وہ مجھ کو ، جیسے وہ کہتے ہوں :
" آ اور پڑھ لے انہی ہماری آنکھوں میں تقدیریں اپنی "
اور پھر کبھی کبھی تو ان کی نظریں یوں کہتی ہیں :
" تو کیا چھپے گا ہم سے ؟ ہم نے تو پڑھ لیں تیری آنکھوں میں سب تقدیریں تیری "

جانے ان لوگوں کو کیا ہے ؟
جانے ان لوگوں کے لہو میں چکنی سی یہ سیاہی کہاں سے آئی ہے ، جو مجھ کو دیکھ کے ان کے چہروں کو فولادی رنگ کا کر دیتی ہے ،

میری قسمت کے یہ دام چکانے والے ،
میں تو ان کے دلوں کو پڑھ لیتا ہوں
میں تو ان کی روحوں پر چیچک کے داغوں کو بھی گن لیتا ہوں جب وہ تازہ لہو سے بھر جاتے ہیں ،
میرے سامنے تو ہے ان کا وجود بس ایک تماشا......
تیرے ارادوں کی نگری میں اُن لوگوں کا تماشا ،
لوگ جو اپنی تدبیروں پر بھولے ہوئے ہیں ،

30 اکتوبر 1968

یہ بھی کوئی بات ہے......

یہ بھی کوئی بات ہے کہنے کی
لیکن لو ہم کہے ہی دیتے ہیں،

دوہا ، بول ، گیت ، کیا رکھا ہے ان میں......
زخم بھلا کب سلے ہیں شبدوں سے......

جاتی سطروں سے کب ڈھلی ہیں تقدیریں
بس، یہی ، لے ، دے کے ، کچھ عرصے کو ،
دھیمی دھیمی سی وہ جلن دب جاتی ہے، جو
اس وقت ابھرتی ہے ،
جب دل میں گھن لگتا ہے ،

آخر ذرا سی اس تسکین کی خاطر ، کون
سارے جگ کا بیر سہے ،

کون کہے ؟ کیا حاصل ہے اس بات کے کہنے سے ؟
بات بھی یہ کہ زمانے میں :
زینہ بہ زینہ بندے پر تو بندے کی تلوار معلّق ہے

چھوڑیں بھی اس بات کو......چلو یہی سوچیں
شاید اک دن کوئی سچ اِس سچ کو جھٹلا دے ،
(اپنا دل تو اگرچہ مشکل سے یہ مانے گا...... !)

7 نومبر 1968

ساری نسل پہ گذرا ہے یہ قیامت کا اک دن ،
ایک ہی دن میں کٹ گئے ، کیسے کیسے ، رعنا ، مست ، جوان
اب تو سب پر لازم ہے
حفظِ وجود ،

سعئی بقا ،
جیسے بھی ہو ، آج سے اک اک فرد کرے ،
زائد کام ،
بڑھ کر ، چڑھ کر ، گھٹ کر ، گھس کر ، پہلے سے بھی زیادہ کام ،
اب تو جُٹ جائیں ، اس کام میں سب کاسی ،
رَچ مچ کے اور مل جُل کے ،
اک یہی کام
ہِس ہِس کے اور ہِل ہِل کے ،

دَم دَم ، دُم دُم ، یہی جَتن
کندھے تول کے ، پنجے جوڑ کے ، پیہم اک یہی کام
ہم اس نسل کی رعنائی کے محافظ ہیں ،
نسل بیضا ، فخرِ جنّ وانس و وحش و طیور ،
اب تو پیہم یہی جتن ،
جانے پھر کب چوبی تختے بچھ جائیں ،
اورہمارے وِیروں کے سر کٹنے لگیں ،
بڑی بڑی توندوں والے عفریتوں کی خاطر
جن کے پاک مُعطّر جسم ہماری ہی روحوں کے فضُلے ہیں !

9 نومبر 1968

یوں تو اس چوکور تپائی کی اس سادہ سی بیٹھک میں کیا رکھا ہے،
لکڑی کی اک عام سی شے ہے، پڑی ہے،......
یوں تو اس پر رکھے ہوئے گلدان میں کیا رکھا ہے،... ..
پیلے پیلے سے کچھ تازہ پھول ضرور ہیں اس میں......
پھول تو گلدانوں میں ہوتے ہی ہیں،
اور پھر اس چوکور تپائی پہ گرنے والا، ہوا کا ترچھا جھرنا،
جس میں دھوپ کی نازک سی جھلکی سونے کا رنگ بکھیر گئی ہے
خَیر، یہ دھوپ کی رنگت بھی تو جگہ جگہ ہے

لیکن یہ سب چیزیں اور یہ چاروں خالی کرسیاں اور یہ سب کچھ، مل کر،
ایک عجب آسودہ سی ترتیب ہے، ساکت ساکت،
میرا ذہن کچھ اتنا الجھا ہوا ہے، مجھ کو چیزوں کی ترتیب اچھی لگتی ہے
جانے...... کون یہاں آ کر بیٹھے گا......
سب کچھ اک آنے والے اچھے سمے کا اَن ہونا پن ہے

11 نومبر 1968

دُور ، اُدھر ، اُس سامنے والے رستے سے ، جب
آپس میں ٹکراتی آوازوں کی لہر اچھل کر میری جانب والے رستے تک آئی
بیچ میں ، نیچے ، پانی تھا ،
بیچ میں ، نیچے ، اک میدان اور اُس میں گھاس اور پودے اور سب کچھ
پانی میں تھا ،

ٹھنڈی رات کے سائے تھے ،
سامنے والے اُس رستے سے آوازوں کی گونج جب اُچھلی ، نیچے پانی تھا ،
رات کے سایوں میں اُس پانی پر اک چوٹ سی پڑتی تھی
تیزی سے اک آہٹ ڈبکی بھرتی تَیر کے بڑھتی تھی
گیلے گیلے پہناووں کو جھٹکتی کیچڑ میں تھپ تھپ چلتی تھی

16 نومبر 1968

جدھر جدھر بھی دیکھوں——
ہر سو پھول ہیں کانٹے ہیں، کرنیں ہیں اندھیارا ہے،
پھر یہ سب کچھ——اک اک راحت اک اک جھنجھٹ——آپس میں گڈ مڈ ہے،

اور یہ سب کچھ مجھ کو گھیرے ہوئے ہے،
ہر دم ایک عجیب پریشانی ہے، جس کے باعث
اپنے جی میں لہو کے پسینوں کی ٹھنڈک ہے

کتنے اچھے ہیں یہ سب الجھیڑے،
سمے کی رو میں دھب دھب چلتے دھندے
کتنی بھلی ہے اک یہ بے مصرف سی مصروفیت،
ذہن پہ اک یہ پردہ، جس کے اوجھل ہیں وہ باتیں
جن کا دھیان بھی مجھ کو سب خوشیوں سے ناخوش کر سکتا ہے،
دھیان اُن کا، جن کے قدموں کے نیچے میرے باطن کی مٹّی ہے!

اک دن یہ مٹّی ان کے قدموں کے نیچے سے سرک گئی——تو…… !

7 دسمبر 1968

چھٹّی کے دن گھر سے تو وہ اس کارن نکلا تھا،
ذرا گلی کے ہٹّی والے سے کچھ سودا سلف خریدے،
اور پھر آ کر ترشے ہوئے کرداروں کے میلے میں گھوسے......

اُس میلے میں وہ سب کچھ تھا،
اس میلے کے باہر تو وہ اپنے آپ سے بھی چھپتا تھا،
میں بھی اُس میلے کے باہر اُس سے پہلی بار ملا تھا۔
اس کے سان گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی، یوں میں اک دن، اتنے قریب سے،
اُس کی زینی آنکھیں، اس کے نیلے چپٹے ہونٹ اور اس کے رخساروں کے
میلے ڈھیلے گول مسام بھی دیکھ سکوں گا

لیکن وہ نہیں جھجکا،
میں ہی اس کے اصلی روپ کو دیکھ کے سہم گیا تھا،
اس کے گرد تو اک وہ سکر کا ہالا ہی اچھا تھا
یہ سوچا اور اس سے رخصت چاہی،

اس دن شام کو پھر میلے میں اس سے ملا میں......
میں نے اس کو پایا سارے حربوں سے مُسلّح،
چہرے پر اکسائے ہوئے کچھ ایسے تیور،
جیسے وہ بس کاٹھ کی روٹی اور پرنور خیالوں پر زندہ ہو،

9 دسمبر 1968

اِن لوگوں کے اندر ، جن کے اندر میں بھی ہوں ،
میرے برعکس ، ایسے بھی ہیں کچھ لوگ ،
جن کی باتوں کے کچھ سچّے روپ ،
اُن کے حربے ہیں !
لیکن یہ سچ ان کا نہیں ہوتا ،
یہ سچ اوروں سے چھینا ہوا ہوتا ہے ،
اپنے جھوٹ اور اپنی بدی کے چھپانے کی خاطر ،
وہ اوروں کی اک اک اچھائی کو ہتھیا لیتے ہیں ،
اور پھر اس ہتھیار کو لے کر جب وہ چلتے ہیں ،
ساری دنیا ان سے ڈرتی ہے ،
کیا زمانہ ہے ،
جب اچھوں کی سب اچھائیاں بروں کے ہاتھوں میں
حربے ہیں ،
سچے لوگ اگر جیوٹ ہوں ، کون اُن کے منہ آئے گا ،
جھوٹ کے اس تالاب کے سب کچھوے
اپنے اپنے خول میں ، اپنے اپنے کالے ضمیروں میں چھپ جائیں گے ،

16 دسمبر 1968

سب کو برابر کا حصہ ملتا ہے......

سب کو برابر کا حصہ ملتا ہے ، اُس میعاد سے ، جس کو
دن کہتے ہیں ،
سب کے سروں پر ،
سورج کی تقدیرِ سفر ، یکساں لمبی پڑی ہے ،
کسی کے آگے دن کا قد نہیں گھٹتا ،
کسی کی خاطر دن کی حد نہیں بڑھتی
سب دن ، اور سب کے دن ، کٹ جاتے ہیں ،
سب گذرے دن ، سب کے گذرے دن ، سب اک جیسے ہیں ،
کھوئی ہوئی اس پونجی میں سب سانجھی ہیں ،
تیرے دن ، جو تیری آنکھوں کی ٹھنڈک میں گذرے
میرے دن ، جو دل سے نہ گزرے
آج وہ کیا ہیں ، کسی خلا کے خانے ، خالی خالی خانے ،
دیکھیں تو سہی ، کھولیں تو سہی ، ان خانوں کو ،

31 دسمبر 1969 ـ یکم جنوری 1969

اے ری چڑیا......

جانے اس روزن میں بیٹھے ،
تو کس دھیان میں تیری ، چڑیا ، اے ری چڑیا

بیٹھے بیٹھے تو نے کتنی لاج سے دیکھا ،
پیتل کے اُس اک تل کو جو تیری ناک میں ہے ،
اپنی پت پر یوں مت ریجھ، خبر ہے ، باہر
اک اک ڈائین آنکھ کی پتلی تیری تاک میں ہے ،
تجھ کو یوں چمکارنے والوں میں ہے
اک جگ تیرا بیری ، چڑیا ، اے ری چڑیا

بھولی، تو یوں اُڑتی ، پنکھ جھپکتی ،
یہاں کہاں آ ٹھہری ، چڑیا ، اے ری چڑیا

یہ تو میرے دل کا پنجرہ ہے ، تو اس میں
اپنی ٹوٹی پھوٹی خوشیاں ڈھونڈنے آئی ہے ؟
پگلی ، یہاں تو ہے ہیرے کی کنی کا چوگا
اور اک زخمی سانس اس پنجرے کی انگنائی ہے !
اُڑ اور لہکی ہوئی بن بیلاڑیوں میں
جا ، چن اپنی لَے ، ری چڑیا ، اے ری چڑیا

12 جنوری 1969

اُس کا سرما سارا گذرا—دور کہیں اک دھوپ کے گھر میں
سرما ، جو اس کا بچپن تھا ،

اب جب دن بدلے ہیں اور ھوا کی ردا سے برف کے ٹانکے اُدھڑنے لگے ہیں
نئی رتوں کی یہ بنجارن بھی دیواروں سے ٹکراتی آ نکلی ہے ،—اپنے منگیتر
کے ساتھ ، اس کمرے میں
اُڑتی گاتی :
,, چچ چچ چوں چوں ، یہ بھی کیا بسرام ہے...
روزن...جن میں خوشیاں پنکھ سمیٹ کے چھکیں ،
آنگن...جس میں اتنے پھول اور ریزۂ زر کا ارزن
پل بھر تو اس طاق پہ بیٹھیں ، چوں چوں ، چچ چچ

لیکن اے ہے ، کون ہے یہ اس شیش محلکے میں اُس جیسی ،
کون ہے پہلے سے یہ بیرن ،

جھپٹ جھپٹ کر اُس نے اُس چہرے پر کالک مل دی
اور اب وہ اور اُس کا منگیتر دونوں ، گلے پھلا کر
کتنے تاؤ میں اُس بے عکس آئینے کے آگے بیٹھے ہیں !
باغی . ...جو ہر دور میں اپنے سائے سے لڑنے آتے ہیں

20 جنوری 1969

گہرے بھیدوں والے ، تیرا سحر ہی مجھ کو سمجھائے اک یہ بات—
——بات بھی اک یہ بات کہ اپنے پاس ہے جو کچھ سب ہے تیری دین
اور پھر——اک یہ برتا بھی تو تیری دین ہے ، جس پر ہم

اپنے آپ میں تُل کر جیتے ہیں ،
کبھی کبھی تو اپنے آپ میں بھر جاتے ہیں ایک ہی ٹھنڈی سانس کے ساتھ
میلے من کی بھروائی ،
تو نے ہم کو سونپا بھی تو اک یہ کیسا کام ،
بیٹھے ہیں ،
آنکھیں روح کے بوجھ سے ابلی پڑتی ہیں ،
کہیں پپوٹوں میں ہے اپنے وجود کے ریزے کا اٹکاؤ سا ،
اب کیا ہو سکتا ہے ، اپنے جواز کے آگے اپنی سب تردیدیں بے بس ہیں ،
اندر ہی اندر کوئی شے تالو سے ٹکرائی ہے ،
ہم کہتے ہیں "اب تک... ٹھیک ہے ، آگے ... دیکھیں گے !"
جانے یوں کن کن بھیدوں کی کٹھالی میں تو ہمیں پرکھتا ہے ،

جانے یہ بھی اک کیا بھید ہے ، یہ جو میری بابت تیرے گمان کا اک دکھاوا سا
میرے ذہن سے گذرا ہے !

7 فروری 1969

مرے ہوئے اس اک ڈھانچے کے حق میں—یہی تو ہے بس سارا غم اور سب اندوہ،
یہی تو ہے اک دکھ کی صورت، ظاہر میں—اور—سارے مظاہر میں،

سامنے والے دانتوں کے اندر کی طرف،
جیبھ کی نوک مسوڑھوں کی سوجن کو اک دوبار چھوئے
بڑا کرم ہو اگر آنکھوں پر پلکیں بھی کچھ جھک آئیں،
اشکوں کو تو دور سے آنا ہوتا ہے۔
اور اُن کے آنے سے پہلے آپ کو جانے کی بھی جلدی ہے
تو بس اتنا کچھ ہی کافی ہے،
اتنا کچھ ہی تو ہوتے ہیں سارے غم اور سارے سوگ،
چہرے پر اک لمبی پیلاہٹ،
اور ایسے میں جیبھ کی نوک مسوڑھوں سے یوں چپک کے گرے،
جیسے اک بے حرف آواز کہے
"کتنا اچھا آدمی تھا..."

ذرا سے اپنے اس اک استحقاق کی خاطر آج تو میں نے مر کر بھی دیکھا
ایسا وقت جب آئے تو آپ اتنا کچھ تو کیجئے گا،
اپنی اس کم فرصت رنجوری کے باعث

27 فروری 1969

اے رے من ، تیرے بھی تو ہیں کیسے کیسے دکھاوے ،
آج تو میں نے بالکل واضح دیکھا......اس کا چہرہ......
جیسے وہ زندہ ہو !

دھوپ میں چلتے چلتے ، میں نے دیکھا،......اس کا چہرہ
چہرہ.......جیسے ہوا کی تہوں کا چھلکا......
میں جس دھوپ میں تھا وہ دھوپ تھی اس کے گرد اک چھتری
جس کی چمک میں
چینہ چینہ چیچک سے وہ چہرہ ویسا ہی چترک تھا ،
جیسا دنیا میں تھا ،
اور وہ دانے اب بھی چمکتے چمکتے بھلے لگتے تھے -

جانے اب وہ کس دنیا میں ، کچی اینٹوں کی چھتری والے کون سے گھر میں
کن اندھیاروں میں ہو ،
وہ... . جس کی بابت سوچوں تو سینے میں اک جھلی تپ جاتی ہے ،
وہ......جو مٹی میں اب......مٹی کا چھلکا ہے ،
مٹی......جس پر بارش کے دانوں کے دھبّے ہیں -

شاید تیرا ہی یہ پاگل پن تھا ، کون اب اس کو دیکھ سکے گا ،
اے رے من ، تیرے بھی تو ہیں کیسے کیسے دکھاوے
تجھ پر ہنسنے کو جی چاہا
ورنہ یوں کوئی یاد آئے تو آنسو کس سے رک سکتے ہیں

10 مارچ 1969

ان کے جسموں کے پیچاک تو دیکھو ،
ان کے جسموں پر یہ زرہیں بھی تو دیکھو
کسے کسے سے لپیٹوں والی زرہیں
جن سے اپنے گماں میں وہ اپنی روحوں کی رکھوالی کرتے ہیں
کسے کسے سے لپیٹوں والی زرہیں تو ان کی سوچوں کے سمٹاوے ہیں
جن کے ذریعے ،
ہم پہ جھپٹنے سے پہلے وہ
اپنے آپ کو اپنی روح کے اک کونے میں سمیٹ لیا کرتے ہیں
اور پھر ان کے سب اعضا سب عضلے کسے کسے سے نظر آتے ہیں
جیسے رسّے ،
جیسے ، ابھی ابھی جب بٹے بٹے سے رسّوں کے یہ مُٹّھے
کھل کر بکھریں گے تو اژدر بن جائیں گے ،
اس دن میں نے دیکھا جیسے اک اک کرسی پر رسّوں کا مٹّھا بیٹھا ہو ،

21 مارچ 1969

نظم*

میں نے اُس کے ارادوں کا یہ سفر دیکھا ہے ،
ابھی ابھی وہ اُس پرنور حویلی میں تھا ،
جس کے گرد سنہرے گلابوں کے تختے تھے
اور اب وہ اس مٹی کے تابوت میں جا لیٹا ہے

میں نے دیکھا
اُس نے اپنی اس اک عمر میں جتنی زندگیاں پائی تھیں
آج اس کی میت کے ساتھ نہیں تھیں ،
وہ تو اب بھی سب کی سب اس دنیا میں ہیں
جو بھی چاہے ان کو چن لے اور آنکھوں سے لگا لے

*حضرت سید منظور حسین شاہ نقوی مجددی کے نام

30 مارچ 9691

اُن کی جیبوں میں ہیں ارض و بقا کی کلیدیں ،
لیکن ان گچھوں کی ایک بھی چابی ان کے دل کے کالے تالے کو نہیں لگتی ،
اور وہ ننگے پیروں چل کر تیری چوکھٹ پر آتے ہیں ،
تیری جلالت والے چتر کے آگے جھک جاتے ہیں ،
ان کی رُوح کے ایک پرانے گڑھے سے خلوص کا لاوا ابل پڑتا ہے ،
وہ روتے ہیں ،
تجھ سے ، مانگتے ہیں ، وُہ سب کچھ ، جس کو تو نے تیاگ دیا تھا ،
اور ادھر ، اک میں ہوں ،
کیسے مانگوں تجھ سے وُہ دنیا ، جس کا سورج اک دن تیرے دل سے ابھرا تھا ،
اپنے پاس تو اس دنیا کے ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں ہوتے ،
جس دن ہوں بھی ، اس دن اپنا ارادہ بھی نہیں ہوتا ،
تیری نورانی مٹی سے باہر جو مٹی ہے ،
جانے اس مٹی میں کیسے کیسے کافر تیری محبت میں جیتے ہیں ،
تو نے دیکھا......!

14 اپریل 1969

میری عمر اور میرے گھر سے باہر ،——اس دائم آباد محلّے——اس اینٹوں کے ابد میں ،
وہ جو کچھ عمریں ہیں نیچی نیچی چھتوں کے نیچے——
اُن کی نمود اور اُن کی نمو سے میری پلکوں میں ٹھنڈی سوجن ہے
ان کو دیکھ کے میں دنیا کو بوجھل بوجھل نظروں سے تکنے لگتا ہوں

کتنے اچھے تھے وہ میرے گزرے دن ، جو اب ان عمروں میں ہیں ،
جب یہ عمریں میرے گزرے دنوں سے گزر کر ، اک دن میرے نہ ہونے میں ہوں گی ،

تو جانے میری بابت کیا سوچیں گی......
اک یہ خیال آتے ہی میں نے اپنے گھر کی طرف دیکھا ہے ،
تو ان اینٹوں کی عمروں پر رشک آیا ہے ،
جیسے آج نقابوں میں یہ نظریں ، بجلی کے ریشوں سے بُنی ہوئی یہ خانے دار کمندیں
میری روح کو چھو کے پلٹ جاتی ہیں -
ویسے ہی ، کل بھی شاید یہ نظریں ، اک بار اٹھیں ان اینٹوں کی جانب
اینٹوں کی یہ چادر، جس کا اک پلو ہی باہر تیرے گا جب میرا پیکر گارے کے گرداب میں ہوگا -

پھر بھی آج تو سوکھے سوکھے حلق اور سوجی سوجی پلکوں سے
اس دنیا کو دیکھنے میں جو دکھ ہیں ، جو ارماں ہیں ، یہی تو عمروں کا حاصل ہیں -

13 مئی 1969

بندے ،
جب پلکوں کے جُڑے جڑے گچّھوں کے نیچے ، تیری آنکھوں میں اک
لمبے گھیرے والے عندیّے کا ہلکا سا پھیرا پڑتا ہے......
جب ایسے میں تیرے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر ایک ارادے کا بوجھ آ پڑتا ہے ،
اور وہ ہونٹ آپس میں اور بھی دب جاتے ہیں ،
اور ٹھوڑی کے نیچے اطمینان کا اک لٹکاوا ابھر آتا ہے ،
تب تو تیرے گمان میں دنیا کے ہر ذرّے پر تیرے چہرے کا سکّہ ڈھل جاتا ہے -
تب تو ڈرنے والے ڈر جاتے ہیں -
اپنے غرور میں جینے والی مٹی کی اس مورت کو دیکھ کے ،
ڈرنے والے ڈو جاتے ہیں !

اور میں اس تیری مورت کی بے علمی سے ڈر جاتا ہوں
جس کو علم نہیں وہ کرنوں کی بوچھاڑ میں ہے اور ان جھالوں میں جھڑ جائے گی

اور یہ میرا ڈر ہی میری سب سے بڑی ڈھارس ہے ، میری اس بے اطمینانی میں ،
تو میری اس ڈھارس سے ڈر ، اپنے کالے ارادوں میں جینے والی مٹی کی مورت

21 مئی 1969

اپنے یہ ارمان......

اپنے یہ ارمان تو سب غرضیں ہیں ، کھری بھی اور کھوٹی بھی ،
ان سب غرضوں کی دُھن میں اس کی دُھن ہے ،
اور ہمارے خیالوں کے اندر تو بھونروں کی روحوں کے بھنور ہیں ،
امڈ امڈ کر اپنی غرض کی سیدھ میں ہم آتے ہیں ،
جو بھی رستہ کاٹے اس کو ہم ڈستے ہیں ،
پھر جب من کی باتیں پوری ہوتی نظر نہیں آتیں ،
ذہن ہمارا دنیا کے بھیدوں کو پرکھنے لگ جاتا ہے ،
اک یہ پَرکھ ہی تو ہے جو یوں نفرت سکھلاتی ہے
اپنی محرومی لاکھوں شاخوں والی اک قدر ہے ، جس کی
سب سے مقدّس ٹہنی پر نفرت کا پھل لگتا ہے ،
میرا جی تو بھر بھی چکا اس پھل سے ،
کب تک دیکھوں میں ، ٹیڑھی پلکوں سے ، ان لوگوں کو ،
میری دید سے جو غافل ہیں ،
کیوں نہ بہا دوں ، اک تنکے کی طرح ، اس دنیا کو ، اُس ندّی میں ، جو
تیری روح کی باھوں میں بہتی ہے ،
منوا ، آج تو تو نے یہ کیا سوچا ،
سدا پھلیں یہ ، تیری میٹھی سوچیں ، مورکھ منوا !

13 جون 1969

وہ تلوار ابھی تو اک فولادی خواب ہے تیرے ذہن کی آن تھک کارگھوں میں
اک دن جب یہ اصیل اور جوہر دار عمل پارے آپس میں جُڑ کر
تیرے دل کی نیام میں ڈھل جائیں گے ،
پھر جب اک دن یہ تلوار چلے گی......،

لیکن اُس دن کے آنے تک——ابھی تو کچھ دن......
لاکھوں روگوں والی نگری میں ، مٹی کی اس پٹڑی پر
اپنے دامن میں کیچڑ کے ان پھولوں کے کو لے کر چلنا ہوگا
ابھی تو اور بہت کچھ ہوگا
نیلی ، ٹین کی یہ چھت کڑکے گی اور سہما سہما وجود بھک جائے گا
باہر جانے کتنی آنکھیں ہنسیں گی اور جبڑے کھنکیں گے ،
ایسے میں تو گھری بنیادوں والے اک سانس کے بل پر ہی ، تو
ان سب کالی دنیاؤں کے بوجھ کو اپنے سر سے جھٹک سکے گا......

لیکن ابھی تو سب کچھ اک فولادی خواب ہے تیرے ذہن کی آن تھک کارگھوں میں
ابھی تو ہر ہونی ان ہونی نظر آتی ہے
ابھی تو سب کچھ ہو سکتا ہے......
شاید تو تھک بھی جائے......
شاید اپنے جی کے اسی جیالے پن میں تُو جی بھی لے

24 جون 1969

یہ دو پہیّے ارض و سما ہیں ،
اور اس اپنی عمر کی سب تسکینیں بچھی پڑی ہیں ان سڑکوں پر ،
دو پہیّوں کے ارض و سما کا جستی دستہ تھام کے ، میں نے
چلتے چلتے اکثر سوچا ہے ، یہ سڑکیں بھی کتنی اچھی ہیں
ان کے باعث میرے دھیان میں آ جاتے ہیں وہ سب اچھے اچھے کام اور اچھی اچھی باتیں
جن کی خاطر ارض و سما کے پہیوں کو میں نے اس پٹڑی پر گرداں رکھا ہے
اور اک عمر کے بعد اب یہ سمجھا ہوں
دھوپ کی لو میں بہتی ہوئی یہ بجریلی سطحیں اچھی ہیں ، اُن لوگوں سے
جو ان پر چلتے ہیں ، جن کے غرور کی جھوٹی ٹھنڈک کبھی بھی ان کے دلوں میں نہیں پگھلتی
چلتے چلتے اکثر میں نے سوچا ہے ، میں کن لوگوں کی دنیا میں ہوں ،
یہ سب کیسے لوگ ہیں ، جن کی آنکھوں میں پتھرائے ہوئے پچھتاوے
کبھی بھی کروٹ نہیں بدلتے
لوگ ، جو اپنے سوا ، ہر اک شے کی جانب بے رخ ہیں
کس نے دیکھا ، میرا دل تو بچھا ہوا ہے ، ان سڑکوں پر ، ان بے رخ قدموں کے نیچے
کس نے دیکھے ، پہیّے ارض و سما کے ، چلتے ہوئے ان بجریلی سطحوں پر ،
کس نے پہچانے وہ ہاتھ ، کہ جن کے بس میں ان پہیّوں کی گردش کا ہر رخ ہے ،

اپنی دھن میں چلتے رہیو ،
چلتے پہیّوں میں چکراتی ہیں جھنکاریں ، چلتے کروں کی
پیڈل روک کے دیکھو ، زنجیروں کے دندانوں میں کتنے بول اٹھتے ہیں

27 جون 1969

جھکی جھکی گھنگھور گھٹائیں
ساون ، پھوار ، ہوا ، ہریاول
رس کی نیند میں جاگتی دنیا ،
کچھ تو بولو ، تم کیوں ہنس دیں
پتھر کے چہرے پہ گڑی اکھیو ،

دل کہتا ہے : "اب کیا ہوگا
ندی ٹیلوں تک لچکے گی ،
بہنے والے ، بہتے بہتے
اپنی ہونی میں ڈوبیں گے"
کچھ تو بولو ، تم کیوں ہنس دیں
مجھ پہ ترس کھانے والی اکھیو ،

تم جانو ، یہ جھونکے ، کس کے
عندیے ہیں ، اور یہ کن کن
تقدیروں کی برکھا ، میرے
ڈرے ہوئے جی میں اتری ہے
کچھ تو بولو ، تم کیوں ہنس دیں
اپنے بھرم پہ لجائی ہوئی اکھیو ،

30 جولائی 1969

ورنہ......تیرا وجود تو سچ کے سمندر میں ہے مٹی کا وہ پشتہ
جس کے باطن کی جھوٹی خود بستگیاں ہی اُس کو سنبھالے ہوئے ہیں

پھر وہ کون ہے جو خود اپنے فوق سے تجھ کو یہ توفیق عطا کرتا ہے
تیرا ہونا ڈوبنے والوں کی آنکھوں میں ڈھارس بھر دیتا ہے
ورنہ تُو تو خود اس ریلے میں ہے اک پشتہ ، بہ جانے والا

پھر وہ کون ہے جو یوں تیری سمت اشارا کرکے
طوفانوں میں گھری ہوئی روحوں کی بے پتوار نگاہوں سے کہتا ہے
"اس تنکے کا بازو تھام لو ، شاید تم بچ جاؤ ، ڈوبنے سے بچ جاؤ"

بندے ، جانے کتنے لوگ ہیں جن کو تیری آس پہ جینا آساں ہے ،
اور تو ، خود وہ پشتہ ، جس کی جڑوں کو بھنور کی درانتی پیہم کاٹ رہی
ہے ،
تو کیا کر سکتا ہے ، بندے
تو خود اپنے باطن کی جھوٹی خود بستگیوں کے سہارے پر باقی ہے

باقی تو ہے اک یہ سچ کا سمندر ، جس کی لہریں ہیں تقدیریں
اور ان تقدیروں کے اچھے اچھے دکھاوے جانے کتنی آنکھوں میں بس
جاتے ہیں تیری نسبت سے ،
کتنی آنکھوں میں ہے اک یہ اداس توقع
کتنی آنکھیں جن میں ایک ہی دیکھنے والا تیری جانب دیکھ رہا ہے
کب تو اس کی جانب دیکھے

4 ستمبر 1969

غزل

ان گنت امروں میں——اور گیا ہے ترے دل کے لئے
ایک جیون ہار سا ڈر ہے————ترے دل کے لئے

رُک کے اس دھارے میں کچھ سوچ——اک یہ اچھا سا خیال
--——جو ترے حق میں ہے ،——کیسا ہے ترے دل کے لئے

اپنے جی میں جی——مگر اس یاد سے غافل نہ جی
جو کسی کے دل میں زندہ ہے ، ترے دل کے لئے

سب ضمیروں کے ثمر ہیں——پستیاں——سچائیاں
جانے تیرے ذہن میں کیا ہے ، ترے دل کے لئے

والہانہ رابطوں میں ، جبر کے پہلو بھی دیکھ——
جو بھی دل ہے ایک پنجرا ہے ، ترے دل کے لئے ،

تو کہ اپنے ساتھ ہے————اپنے بدن کے واسطے ،
کوئی تیرے ساتھ تنہا ہے————ترے دل کے لئے

تیری پلکیں جھک گئیں امجد——دئیے جب یوں جلے
جانے کس کا ذکر چمکا ہے————ترے دل کے لئے

14 ستمبر 1969

گھور گھٹاؤں کے نیچے
پیڑوں کی لچکیلی باہیں
کونپلوں کے کنگن پہنے ،
جھک جھک کر ،
جھیل کے پانی پر سے چُننے آئی ہیں
پیلے پیلے پتے اور بھورے بھورے بادل

جھیل کی جانب جھکی جھکی......
رستے ہی میں جم گئیں شاخوں کی باہیں
جھیل سے کون اٹھا کر دے ان کو
پیلے پیلے پتے اور بھورے بھورے بادل

چاروں اور سے
امڈی امڈی ، گھری چھاؤں ، سہانی ہریاول
تھم گئی آ کر زنگ آلود سلاخوں والی اس کھڑکی کے پاس
جانے جھریوں والا کالا چمڑا میرے دل کا کب اس ٹھنڈک کو محسوس کرے

19 ستمبر 1969

اپنی خوب سی اک خوبی میں......

اپنی خُوب سی اک خوبی میں اُس کے لیے اک مستی تھی
اور اپنی اس خوبی کے لچھّن دیکھے اُس نے سب دنیا سے چھپ کر

اب وہ خوبی بھولا ہوا اک خوابِ خوباں ہے
لوگوں کے ذہنوں میں اُس خوبی کی بابت اب اک میٹھی نفرت ہے
پھر بھی کون اب ایسی باتوں کے بارے میں بات کرے
سب کی زبانیں چُپ ہیں ، سب کے دل اس علم پہ نادم ہیں
ساری معرفتیں اب بے بس ہیں

وہ مچھلی بس اک بار اس گندے پانی میں نہائی تھی
اور اب زرّیں طاق پہ اک شیشے کی صراحی میں لہراتی ہے

اب رنگیں صوفوں میں دھنسی ہوئی وہ سرخ مساموں والے گوشت کی گتھلی
بڑے بڑے لوگوں کی باتوں کے مفہوموں میں ،
تقدیروں کی کھسر پھسر سے بھرے ڈرائنگ روموں میں ،
تیرتی ہے ، اتراتی ہے ،
فرعونوں کی باچھوں میں مسکاتی ہے
کیسی خوب سی وہ خوبی اُس کو راس آئی ہے

تو کس دنیا سے ٹکرانے آیا ہے ،
تو کس جگ کی کایا بدلنے آیا ہے ،
کوڑھی او گنہگار دلا ،

21 ستمبر 1969

دیوں کے جلنے سے پہلے ،
شام کی دھندلی ٹھنڈک میں ،
گھنے درختوں کے پیچھے ،
کل جب تیرے نام کی زرد سیاہی طلوع ہوئی
اور پھر ، اُس کے بعد
رفتہ رفتہ ، جب ہر جانب سے ،
تیرے ذکر کی اک رسزیلی تاریکی اُبھری
تاریکی ، جو تیرے نور کا اک رخ ہے ،
تو اس دم اک جابر دانائی
روحوں کی ظلمات سے یوں گزری
جیسے اچانک رستہ روک کے کوئی کسی سے کہے ،
"ادھر ہماری جانب بھی تو دیکھو
ان مردہ قلبوں کے اندر بجھے ہوئے بلبوں کی نگری میں پھرنے والے
ہم تو اندھیروں میں بھی تیرے ساتھ ہیں ،
ہم جو اندھیروں کے اس بھیس میں اپنی روشنیوں میں اجاگر ہوتے ہیں !"

11 اکتوبر 1969

غزل

اک اچھائی میں سب کایا دنیا کی
اس برتاؤ میں ہے سب برتا دنیا کی

پھول تو سب اک جیسے ہیں، سب مٹی کے
رت کوئی بھی ہو دل کی یا دنیا کی

اس اک باڑ کے اندر سب کچھ اپنا ہے
باہر... دنیا؟ کس کو پروا دنیا کی

ان چمکیلے زینوں میں یہ خوش خوش لوگ
چہروں پر تسکین، دنیا دنیا کی

اُجلی کینچلیوں میں صاف تھرکتی ہے
ساری کوڑھ کلنکی مایا دنیا کی

پھر جب، وقت بجھا تو ان پلکوں کے تلے
بہتے بہتے تھم گئی ندیا دنیا کی

جم گئے، خود ہی اس دلدل میں، اور خود ہی
کریں شکایت، اہلِ دنیا دنیا کی

دنیا کے ٹھکرائے ہوئے لوگوں کا کام
پھروں بیٹھے باتیں کرنا دنیا کی

دلوں پہ ظالم، یکساں سچ کا پہرا ہے
کوئی تو جھوٹی ریت نبھا جا دنیا کی

20 اکتوبر 1969

ننھی ، بھولی ، میلے میلے گالوں والی ، بے سدھ سی ، اک بچی —— تیری
جانب دیکھ رہی ہے
دیکھ ، اس کی آنکھیں تیری توجہ کی پیاسی ہیں ،

اس کی نازک ، بے حس ٹھوڑی کو اپنی انگلی کی سنہری پور سے مَس تو
کر اور اُس سے اتنا تو پوچھ :
''اچّھی بلّو تو کیوں چُپ ہے ؟''

اور جب وہ منہ پھیر کے اپنی آنکھیں اپنے ہی چہرے پہ جھکالے
تُو ہی بڑھ کر اُس کے ماتھے کو اپنے ہونٹوں سے لگالے —— ہاں ، ایسے ہی !

کیوں ، اس جھنجھیلوں نے تجھ سے کہا کیا
یہ کیا ؟ تیری آنکھیں بھیگ گئیں ؟ کیوں ؟
اس نے تجھ سے کہا کیا ، ساتوں آسمانوں کے مالک
اتنے پتلے دل والے مالک ، ہم بھی روز اس چہرے کی کتھا سنتے ہیں
ہم تو کڑا کر لیتے ہیں اپنا جی..... ایسے موقعوں پر

5 نومبر 1969

باتوں باتوں میں وہ لوگوں کے ذہنوں سے کوڑا کرکٹ چن لیتا ہے
لوگوں کے ذہنوں سے ، اوروں کے بارے میں ، ایسی ایسی باتیں چن لیتا ہے ،
جو دنیا والوں کی کھلی باچھوں میں سفر کرتی ہیں -
یہ باتیں اس کی دانست کا سرمایہ ہیں ،
یہ سرمایہ ایک گھمنڈ ہے ، کڑواہٹ کا ،
اس کے رخ پر بکھرا ہوا ہے وہ سب لوہا ، جو اس کے دل کا لہجہ ہے ،
اس کے باہم بھنچے ہوئے ہونٹوں کا دباؤ جب اس کی آنکھوں کو چمکا دیتا ہے ،
عرشوں کے محلوں میں فرشتے ڈر کے مارے اپنی شمعیں بجھا دیتے ہیں -

میری طرف آج اس نے یوں دیکھا ہے
جیسے میں بھی اس کے غرور کا اک لقمہ ہوں ، اس کی دانستوں میں ،
آخر اس کے پاس اک علم ہے میری بابت ،
آخر کل ہی تو وہ آسمانوں پر جا کر
اپنے ذہن کی چوپتری پر آنے والے دنوں کا ٹیوا اتار کے لے آیا ہے

16 نومبر 1969

تم کیا جانو، مجھ سے پُوچھو——میں اس مٹی کی سُوکھی پَتلی تہ پر
کھیلا ہوں
اسی مٹی کی تہ کے نیچے گدلا گاڑھا گہرا پانی ہے سیلانی سیلابوں کا،
پھر وہ دن بھی بڑے کچھ ایسے تھے،
اور تب علم بھی مجھ کو نہ تھا اُن دنوں کا جب ہر ذرّہ سورج بن جاتا ہے
ہر سُو، مٹی کی اس سُوکھی پتلی تَہ پر، لوگ نرالے دنوں کی خوشی میں
چوکڑیاں بھرتے پھرتے تھے،
اور کچھ میں بھی تھا اک ایسی دنیا میں، جس میں سارے لوگ اک
جیسے تھے
تُم کیا جانو، کن جتنوں سے اَب میں ان وقتوں کی ساری دلدلیں پھاند کے
اُس دنیا تک پہنچا ہوں،
جس میں اب میرے سوا سب کچھ ہے!

تُم کیا جانو، تُم آج اک مجھ سے نفرت کرنے والی شفقت اپنی آنکھوں
میں بھر کر آئے ہو،
یہ نفرت تو اک مُزمن بے علمی ہے،
اور یہ شفقت بھی تو خود افروز دلوں کی اک متعدی بیماری ہے،
میری ساری دعائیں تم پہ تصدق، کیا تم یوں میری بے مائیگیوں کا مول
چکا سکتے ہو!

دیکھو، تم تو خود مٹی کی اس سوکھی پتلی سی تہ پر اور کروڑوں
آدمیوں کے ساتھ کھڑے ہو
جس کے نیچے سیلانی سیلابوں کا پانی ہے!

29 نومبر 1969

جب تو ان کے گھر کے صحن میں اک مینا تھی ، چاندی کے پنجرے میں
تجھ کو وہ دن اچھے لگتے تھے ، نا
تب تو تجھ کو اس کی خبر بھی نہیں تھی..... تیرے آب و دانے میں
کیا ہے
تجھ کو خبر بھی نہیں تھی......
تب تیرا چوگا تو انگوروں کے رس میں گندھا ہوا نمکیلا بھیجا تھا
اُن جاتی آنکھوں والی بے تن کھوپڑیوں کا ،
جن کے سہمے خلیوں میں اک وہ چنگاری چٹکی تھی جو سر بقا ہے
تجھ کو وہ دن اچھے لگتے تھے ، نا
اور اب بھی تم کو وہ دن یاد آتے ہیں نا—— اب بھی
اب جب تلواروں کی نوکیں تیرے گلے پر رکھ کر تجھ کو پیار بھری
نفرت سے یوں چمکارنے والے
اپنے جسموں کی مٹی میں خوابِ فنا ہیں

میری باتیں سن کر ، مجھ کو ٹک ٹک دیکھنے والی ،
چو کور آنکھوں والی ، مینا
ہاں وہ قاتل اچھے تھے ، نا
اب تجھ کو وہ دن یاد آتے ہیں ، نا
اب اس وادی کی بھرپور گھنی سبز لتا میں اُڑنا اور یوں راتب چننا کتنا
مشکل ہے
اب تو اُڑنے میں تیرے پر دکھتے ہیں نا ،

دسمبر 1969

اور اب ، یہ اک سنبھلا سنبھلا ، تھکا تھکا سا ، شخص
اب بھی جس کے جھریوں والے چہرے پر اک پہلی سوچ کا بچپن ہے -

ساری عمر اس کی
اپنی اس اک دھن کو بڑھاوا دینے میں گزری :
"مگن مگن بیٹھیں——
چاندی کی چھت کے نیچے
اس قرنوں کے بچھونوں پر
مگن مگن بیٹھیں !
چُنیں خود اپنے خیالوں کے کنکر
یہ کنکر مل کر بن جائیں گے لوحیں
لَوحیں ، جن کو دنیا اک دن پوجے گی......"

اور اَب یہ اک شخص......
اک جانب کو اُس کے قد کا جُھکاؤ......
اور اسی جانب کے بوٹ کی ایڑی گھسی ہوئی
اور اسی جانب کا کوٹ کا پلّو مُڑا ہوا ، اک جامد بازو کے نیچے
اور وہ خُود ساکت
اس کے گرد ہزاروں تیز ہراساں قدموں کا اک لہراتا جنگل ،
اور وہ ان قدموں کے سفر میں تنہا ،
جاتے جاتے کسی نے پوچھا : "بھائی کیسے ہو"
اُس کی آنکھوں میں بچپن لوٹ آیا ،
ہنس کے وہ کہنے لگا :
"تم تو مجھے پہچانتے ہو ، تم جانتے ہو جو زینہ تمھارے دل سے میرے
دل تک ہے ،

تم میرے دل تک آ سکتے ہو ،
آؤ گے ،
آؤ ، بیٹھ کے اپنے خیالوں کے کنکر رولیں
یہ کنکر مل کر بن جائیں گے لوحیں
لوحیں ، جن کو دنیا اک دن پوجے گی ،
اور پھر اک دن امڈ پڑے گا زمانہ ہماری طرف"

اور وہ اک لمبے رستے کی شطرنجی پہ اکیلا کھڑا تھا
اور جو قدم ابھی اس نے آگے کو بڑھانا تھا اس ایک قدم کا کرب
اس کے بھر بھرے سے چہرے کے سیلے مساموں تک رس آیا تھا ،
اور——
اس کا ماتھا چاندی کا تھا !

14 دسمبر 1969

غزل

دو طرف بنگلے ، ریشمی نیندیں ...،
اور سڑک پر ، فقیر اک ناتگا

اب کے تو ، بک گیا ، سر مسجد
ان سیہ آڑھتوں میں اک بانگا

سبز پتّوں کی اک فصیل ابھری
جب بھی گنجان باڑ کو جھانگا

وقت کے گھاٹ پر ، کسی کو تو ہو ،
اپنے دل میں اُترنے کا ہانگا

19 دسمبر 1969

کہاں سفینے اس خود موج سمندر میں اُن روحوں جیسے ،
روحیں ، جن کے خیال سے میں جیتا ہوں ،

جب دریا چڑھتا ہے اور جب اس کی کوئی سیہ سی لہر اچانک
میرے دل کے ٹھنڈے پانیوں کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے
تو میں سب پتواریں چھوڑ کے ' بے بس ہو کر ، اتر جاتا ہوں
ان ہونے امروں کی سنشاؤں میں ،
اور اس ، اک وقفے میں ، ڈرتے ڈرتے
جلدی سے بھر لیتا ہوں ، اپنی آنکھوں کی کشتیوں میں ، اُن سب لوگوں کو
جن کے خیال سے میں جیتا ہوں
تب میری پلکوں کے سایوں میں یہ روحیں ، سب اک ساتھ ، اکٹھی
کشاں کشاں اس کوشش کے محور میں آ جانے کا جتن کرتی ہیں
جس کی کشش سے سب دریا چڑھتے ہیں

کہاں سفینے ، اس خود موج سمندر میں ، اُن روحوں جیسے
روحیں ، جو میرے جی میں جیتی ہیں

1 جنوری 1970

سبھوں نے مَل مَل لیں اپنے چہروں پر
مٹیاں اپنی عمروں کی ،—— اور یوں جو جو شکلیں نتھری ہیں
ان سے ہی اب ان کی پہچانیں ہیں ،

عمروں کی اس مٹّی میں کرموں کے خمیر کی ابھرن ہیں یہ شکلیں
اپنی اپنی گزرانوں میں مسخ شدہ یہ چہرے فساد ہیں ان احوالوں کا ،
جن سے ہم سب گزرے ہیں
اک اک شخص کی شکل اُس کی اپنی مشکل ہے
کاش اپنی اپنی مشکل کو سمجھ سکتے یہ لوگ کہ جن کی شکلیں——
——جن کے کرموں کے پھل ، ان کی نظروں سے اوجھل ہیں
——جن کی اصلی مخفی شکلیں تو خود ان کی روحوں کے آئینوں میں بھی
ان کے آگے نہیں اترتیں ،
——جن کی اصلی شکلیں تو حصّہ ہیں، اس اک بڑی بھری تصویر کا ،
جس کو
ساری دنیا اس نفرت سے دیکھ رہی ہے !

20 جنوری 1970

کوہستانی جانوروں برفانوروں کی سمور اس سرما میں تو......
اس کم سن فسطائیت کے گورے جسم پہ اَب بھی ویسی ہی ہے ،
جیسی تھی ، منقوش عباؤں والے گزرے دنوں میں ،
آب بھی ، اس مٹی کے دل میں اپنے ہونے کا ڈر ویسا ہی تھا ، جیسا اَب ہے !
ظلم کی اس بازی میں ، میرا خوف ، اس لمبے عرصے کی شطرنجی پر ،
جانے کن تقدیروں کا پانسہ ہے ،
جانے اس اک ڈر کی بھی کتنی کڑیاں ہیں ، جو سب کی سب میرے لیے ہیں
اور جن کی نسبت سے میری سچی باتیں بھی بے مصرف ہو جاتی ہیں ،
ورنہ میں تو سچے دل سے چاہوں ، کاش اس کھٹ کھٹ چلتی ، فربہ فربہ
گوشت کی گتھلی کے ساتھ اک ایسی کم وزنی بھی پروان چڑھے ، جو
اس مٹی کے ذروں کی طینت میں بٹی ہوئی ہے -
لیکن زرد سمور میں لپٹا ہوا یہ مٹاپا ،
اس نے تو اب کس بھی لئے اپنے دل پر قبضے ، چاندی کے !
اس نے تو اب چھت بھی لیں سب اپنی سوچیں
اب تو اس کے ایک قدم کی نیچ ہیں ، مجھ جیسوں کی صدہا عمریں ،
شاید میری مٹی اسی طرح سے اور ہزار برس ان کالی سرد ہواؤں میں
تھر تھر کانپے گی ،
روندے جانے کا ڈر اس کو روندے گا......

26 جنوری 1970

اپنے لیکھ یہی تھے، منوا،
ورنہ میرا سچ تو سب کا علم ہے اور سب پر ظاہر ہے
میرا سچ تو ہے اس پنجر میں جینے والی اک بے بس آگاہی، جس کو سب نے پرکھا ہے،
میری سچائی کو سمجھنے والے، میرے سچ کے حق میں سچے ہوتے،
تو یوں ان کے دلوں میں، اک اک قبر نہ ہوتی، میرے آنے والے دنوں کی
جیسا کچھ بھی ان کا گمان ان آنے والے دنوں کے بارے میں ہے!

پھر میرا دل کیوں نہ دکھے جب میں یہ دیکھوں،
میری سچائی کو سمجھنے والے
میری بابت اپنے علم کو جھٹلانے کی کوشش میں، ہر گری ہوئی رفعت کو اپناتے ہیں

پہلے میرے ہونے کو اپنے دل میں دفنا دیتے ہیں،
اور پھر میرے سامنے آکر میرے سچ پہ ترس کھاتے ہیں
اور یوں مجھ کو جتاتے ہیں کہ انہیں سب علم ہے، میرا سچ دم توڑ چکا ہے،
میری سچائی کو سمجھنے والے بھی جب یوں کہتے ہیں،
کون اس وار کو سہ سکتا ہے،
میرے دل میں میرے سچ کے قدم اکھڑنے لگے ہیں
اب کوئی تو اک اور جھوٹی سچّی ڈھارس، منوا،
آخر جینا تو ہے،
اور جینے کے جتنوں میں زخمی چیونٹی کی بے بس آگاہی بھی عقلِ کل ہے،

30 فروری 1970

کل کچھ لڑکے آپس میں باتیں کرتے جاتے تھے

ہم تو سب کچھ جانیں ،
سب کچھ ، جس کو دنیا جانے ، لیکن منہ سے نہ مانے ،
رِی ، رِی ، رِی ، ہم سب کچھ جانیں ، کیا ہیں خوشیوں کے یہ سارے دکھاوے ،

یہ سب گھاتیں ،
میلی میلی گلیوں میں یہ لگتی اکھڑتی قناتیں ،
چھل بہل کے اک دو دن اور اک دو راتیں ،
گھی اور گڑ کے قوام سے بوجھل باتیں ،
سارے لوگ ، اک جیسی ذاتیں ،
باہر ، باہر ، بیش بہا سوغاتیں ،
باہر ، باہر ، بڑے گھمنڈ اور بڑی تمکینیں ،
باہر ، باہر ، خوشیوں کے سات آسمان اور سات زمینیں ،
اندر ، اندر ، اتی اتی سی جاگیروں کی تسکینیں ،
اور وہ سب کچھ بھی......رِی رِی رِی ! اچھا ، اچھا ، ہم نہیں کہتے !
اپنے چہرے ڈھانپ کے چلنے والی یہ سب قدریں ، اور ان کی تقدیسیں ،
یونہی ہم پر دانت نہ پیسیں
اچھا ، اچھا ، لو ہم منہ سے کچھ نہیں کہتے ،
گو ہم سب کچھ جانیں ، سب کچھ جانیں ،

28 جنوری 1970

اپنے دل میں ڈر ہو تو یہ بادل کس کو لبھا سکتے ہیں
اپنے دل میں ڈر ہو تو سب رُتیں ڈراؤنی لگتی ہیں اور اپنی طرف ہی گردن
جھک جاتی ہے

یہ تو اپنا حوصلہ تھا ، اتنے اندیشوں میں بھی
نظریں اپنی جانب نہیں اٹھیں اور اس گھنگھور گھنے کہرے میں جا ڈوبی ہیں
اور اب میری ساری دنیا اس کہرے میں نہائی ہریاول کا حصہ ہے
میری خوشیاں بھی اور میرے ڈر بھی

اور اسی رستے پر ، میں نے ، لوہے کے حلقوں میں ، اک قیدی کو دیکھا
آہن چہرہ سپاہی کی جرسی کا رنگ اس قیدی کے رخ پر تھا
ہر اندیشہ تو اک کنڈی ہے ، جو دل کو اپنی جانب کھینچ کے رکھتی ہے ،
اور وہ قیدی بھی
کھچا ہوا تھا اپنے دل کے خوف کی جانب ، جس کی کوئی رُت نہیں ہوتی

میں بھی اپنے اندیشوں کا قیدی ہوں ، لیکن اس قیدی کے اندیشے تو
اک میرے سوا ، سب کے ہیں
اک وہی اپنے اپنے دکھ کی کنڈی ، جس کے کھچاؤ سے اک اک گردن
اپنی جانب جھکی ہوئی ہے
ایسے میں اب کون ، گھٹاؤں بھری اس صبحِ بہاراں کو دیکھے گا ،
جو ان بور لدے اندیشوں پر یوں جھکی ہوئی ہے ، آموں کے باغوں میں ،
مری روح کے سامنے

9 مارچ 1970

دنوں کے اس آشوب کے ساتھ......

دنوں کے اس آشوب کے ساتھ اک تیرے ذکر کا امن بھی جس کو مل جائے
اس کی خاطر ساری مٹھاسیں تیرے نام میں ہیں

تو ہی جس کی خاطر چاہے اپنے نام میں اپنی کشش رکھ دے ،
تیرے امر ، تیری منشائیں جس کے بھی حصے میں آ جائیں......
نہیں تو باقی کیا ہے ، مٹی میں مل جانے والی عمریں ، مجھ جیسی......،
میں......جس کے دل کی سوت میں اک یہ ڈھارس جیتی ہے ،
شاید ، یوں ہو ، سب کچھ تیرے کرم کی رمزیں ہوں
میرا ایسے ایسے گمانوں میں گم رہنا بھی شاید تیرے کرم کی رمزیں ہوں
—ایسے ایسے گمان—
شاید ، تو
خود ہی اپنے آپ کو میرے دل سے بھلوا دیتا ہے
اور پھر خود ہی میری بھول پہ مجھ سے خفا ہو جاتا ہے
یوں دھتکارا ہوا میں جا گرتا ہوں لوہے کی گردن والی ان کاٹھ کی روحوں میں
جن کے آسیبوں سے بچنے کی کوشش پھر مجھ کو تیرے امروں میں لے آتی ہے
اور میری سانسوں میں پھر سے وہ تسبیحیں گرداں ہو جاتی ہیں ، جن میں تیرے نام کے دانے ہیں
اے وہ جس کے نام کے میٹھے ورد میں ازلوں سے وارد ہیں سارے زمانے ، سارے ابد

17 مارچ 1970

تم نے میٹھے مٹروں کی ڈالی سے ، ڈرتے ڈرتے ،
تتلی جیسی ایک کلی کو توڑ کے سونگھا......سوچا ،
اور پھر آنکھیں میچ کے ، اپنے آپ میں ، خود ہی خود ، کملا گئے تم ،
اپنے پاگل پن میں ، اپنے آپ سے روٹھی ہوئی یہ خوشیاں تو سب مندے
کی باتیں ہیں !

آخر ہم بھی تو ہیں......
کتنا مال ہے ، اس دنیا کا ، جس کا بوجھ ہماری پلکوں پر ہے ،
اور یہ پلکیں ہیں جو پھر بھی تنی ہوئی ہیں ،
تم اک بار ہماری آنکھوں سے بھی تو دیکھو ؛
اس پرگنے کی اک اک کیاری میں ہر پنکھڑی سونے کی ٹکلی ہے
اب کے ہم نے پہلے تو یہ پگھلی ہوئی سب اشرفیاں اپنی آڑھت میں سمیٹیں ،
اور پھر ، ان کی اصلی اوسوں کے ساتھ ، ان کے ٹرک بھر بھر کر بھیجے -
میلے میں ، جو اب کے پھولوں کی رت میں آیا ہے ،
سچ پوچھو تو بڑا لگا اب کے اپنا سیزن پھولوں کا
جانے تم کیوں سب چیزوں کو اپنی روح کے تہ خانوں میں بھر لیتے ہو ،
ذرا اس اپنی دل کی کلی کو توڑ کے اپنی نوٹوں والی جیب میں رکھ لو ،
اور پھر مزے مزے سے پھرو اس پھلواڑی میں ،
ورنہ ان زرخیز بہاروں میں کملا جاؤ گے

24 مارچ 1970

بندے ، تو یہ کب مانے گا ، پھر بھی تیرے چہرے کی بھساہٹ میں جو
کچھ میں نے دیکھا ہے ، تجھ سے کہہ دوں ،
یہ تیرا چہرہ ! بس بھر بھرا سا ، اور اس پر گذرے دنوں کے چکٹ سے ،
جیسے راکھ اور اس کے مسام ، اور کالا زرد لہو ، اور سب کچھ ،
میلا میلا سا دکھ ،

تو جس کو پہلے سے جانتا ہے ، وہ رمز اک تجھ سے کہہ دوں ،
میرا اندازہ ہے ، عمر کی اس منزل پہ اگر تو اپنی ان بے چارگیوں پر
جبر کرے — تو

یوں تیری آنکھوں میں لپک لپک کے نہ آئے
وہ شعلہ ، جو تیری روح میں بجھنے کو ہے !
تو سمجھے گا ، یہ سب شاید تیرے دل کی گلی سڑی سازش ہے ،
میں تو یہ جانوں ، اس سازش کا سب ساز و سامان باہر سے آتا ہے ،
بندے ، یہ تو دنیا ہے جو لوگوں سے کہتی ہے "میری طرف آنکھیں
چمکا چمکا کر دیکھو"

مرنے والا جاتے جاتے اس دھوکے میں آ جاتا ہے !
اس دھوکے میں آنے والے کو اک یہ راحت ہے : اپنے آپ کو دھوکا
دے سکتا ہے ،
اپنی جانب آنے والی موت سے آنکھیں پھیر کے پل بھر اپنی بھول میں
جی سکتا ہے ،
اور وہ — تیری طرح — آنکھیں چمکا چمکا کر سدا چمکنے والے چہروں کو
یوں حسرت سے تکتا ہے !
بندے ، اپنی آنکھوں میں اک یہ گدرائی ہوئی للچاہٹ لے کر مت پھر اس
دنیا میں ،
تیرے دل کے گڑھے میں تیری لحد کچھ اور بھی گہری ہو جائے گی :

یکم اپریل 1970

شاید تیرے کرم کا اور ہی کچھ منشا ہو،
یا، اب جو میری حالت ہے، شاید اس میں
امر اک تیری قدرت کا ہو، میرے حق میں
لیکن جس تکلیف میں مَیں ہوں اس کے ہوتے ہوئے میرا دل تو باور نہیں کرتا
میرا دل تو بس اتنا کچھ جانے، بس اتنا کچھ جانے
تو چاہے تو ہر پانسے کو پلٹ سکتا ہے
عینِ کرم میں
عینِ غضب میں
میں تو اپنے خطروں اپنی آرزوؤں میں بٹا ہوا اک وہ ذرہ ہوں
جس کے ذرا سے دل کو
ذرا سا ارماں ہے ان اسنوں کا جو تیرے چمنوں میں ہیں

13 اپریل 1970

کون ایسا ہوگا جو سب کے دلوں کی ٹھنڈک کا رسیا ہو ،
ایسے شخص کے من میں آنی ہوئی اک بات تو وہ جھونکا ہے
جو اک ساتھ زمانے بھر میں پھول کھلا دیتا ہے
اور — یہ بات کہیں باہر سے تو نہیں آتی
یہ تو دل پر ایک گرہ ہے ، جس کا کساؤ کبھی بھی کم نہیں ہوتا
جو بھی اسے محسوس کرے یہ چوٹ سدا اس کے دل پر ہے
جب بھی کوئی اسے اپنی سانسوں میں ڈھونڈھے
اُس کی آنکھوں میں بھر جائیں وہ سیّال شبیہیں
جن کے دکھ اور جن کے جتن ان بستیوں کے گہنے ہیں
جن کی خوشیوں کے لیے جینا ، ان بھیدوں میں جینا ہے ، جو
ازلوں سے ان ذرّوں کی جنبش ہیں
کون ایسا ہوگا جو اپنے دل کی کسک تک پہنچے
اور پھر ایک قدم خود پیچھے ہٹ کر
اپنی پہنچ کو اوروں کے لیے برتے ، سب کے دلوں کی ٹھنڈک کے لیے برتے
کون ایسا ہے ، اس دنیا میں

کتنے خطرے دلوں کو دلوں سے ہیں ، سوچوں تو میرا دل دکھتا ہے
گنگ زبانوں ، بولتی آنکھوں والے چہرے قدم قدم پر مجھ سے جب یہ
پوچھتے ہیں : "کون ایسا ہے ہم کس سے پوچھیں ؟"
اور میرے سینے میں بھیدوں کا سب دھن خاکستر ہو جاتا ہے

21 اپریل 1970

آج تو جاتے جاتے اس نے مجھے اک باسی بھرنے والے پیار سے دیکھا
بڑے اقرار سے دیکھا
اس اک آن میں—میرے سان گمان میں بھی یہ بات نہ تھی : یہ سب کچھ
تھا امکان میں

لیکن
اس نے تو میری سانسوں کا ادھوا پن پہچان کے سب جان کے بھی ، یوں
مجھے دیئے للچاوے اپنی اک مسکان کے ، جس میں
ہارے ہوئے خود اس کے من کا سنبھالا بھی تھا
اور مجھ جیسے ترسے ہوئے پہ ترس کھانے کی کسک بھی
جاتے جاتے اس دل میں جانے کیا بات آئی ہوگی
اور اس ایک نگاہ کے اندر سے جانے کس کس قوت نے یوں میری جانب
جھانکا ہوگا !

—اور اک میں تھا
—اور اُس دن اک میں تھا جس کے لئے ان کبھی نہ ملنے والی سب
اچھی اچھی خوشیوں میں کبھی نہ ملنے والے سب اچھے اچھے دکھ تھے

27 اپریل 1970

پہلی سے پہلے......

دن تو ایک سے ہوتے ہیں سب ،
لہو رگوں میں جب بہتا ہو ،

لیکن جانے اب کے میرے ذہن میں یہ چنگاری سی کیسی چٹکی ہے ،

اب کے مہینے کے آخر میں یہ جو دن آئے ہیں
کچھ یوں لگے ہیں، جیسے
انہی دنوں میں ، میرے وجود کے ذرے کے لیے ، سب سورج چمکے ہوں

سب سورج ،
سب گردشیں ،
سب تاریخیں ،
سارے زوال ، جو تہذیبوں کے سایوں میں ، انسانوں کو روٹی کے ٹکڑے کے لیے ترسانے آئے ہیں

سارے خیال ، جو آنے والے اچھے دنوں کا دھن ہیں ،
اور جو موت کی وادی سے ہو کر ذہنوں میں آتے ہیں

30 مئی 1970

کہاں ہے اب ، وہ جو برسوں پہلے اس مٹی پر دنیا کے نرغے میں ،
اک سورت تھی
اک مورت ، خوابوں کے بچپن جس کی پرستش کرتے تھے

کہاں ہے اب وہ بے کل پلکوں والی پگلی سی اک سچائی
جو اس جھوٹی دنیا کو جھٹلانے آئی تھی
اس مٹی کے نیچے ، اب بھی ، اٹل حصاروں سے اس حجّت کرنے والے
جھونکے کے پیوند ہماری ان سانسوں میں ہیں

لیکن جانے کہاں ہے اب وہ پگلی سی اک سچائی

یونہی کھنکتے کھنکتے قہقہوں والی ناداں عمریں کالی نیندوں میں کھو
جاتی ہیں
کیسی ہیں یہ نیندیں ، جن کے سمندر دلوں کے جزیروں کو ریزہ ریزہ کر
دیتے ہیں
کیسے ہیں یہ ان نیندوں میں تیرنے والے پلٹ پلٹ کر آنے والے خواب
——خواب ،
جن کا بچپن کبھی نہیں ڈھلتا

9 جون 1970

اے وہ جس کے لبوں کی دعائیں

اے وہ جس کے لبوں کی دعائیں ، میری زباں تک بھی پہنچی ہیں ،
اک پستک کے حوالے سے ، جو
دین تھی ایسے ہاتھوں کی ، میں جن کو تھام کے اک دن ، خواب میں ،
علم کے سینہ یاب سمندر سے گذرا تھا ،

آج اس زہریلے پانی کے بھنور میں اپنے پاس یہی اُکھڑے اُکھڑے سے
بوسیدہ سے ورق ہیں
اور یہ مٹے مٹے سے لفظ ، کہ جن پر تیرے ہونٹوں کی مہریں ہیں ،

تیرے ہونٹوں کے دہرائے ہوئے یہ لفظ مرے ہونٹوں پر جب آتے ہیں ،
تو اس بھنور میں میرا دل بس سوچتا ہے اک تیری بابت
تیری بابت ، تیرے زمانے ، تیرے دنوں کی بابت ،
تو اور بٹے ہوئے رسّوں جیسے وہ بازو
ٹکڑے ٹکڑے ، اکڑے اکڑے سے وہ تیرے ہات کڑکتی پتواروں پر
——اور وہ تیرے تھکے تھکے سے چہرے پر ان تھک تسکین ،
جیسے دریا سب تیرے ہیں
جیسے لہروں سے لڑنے والے بازو سب تیرے ہیں

17 جون 1970

گدلے پانی

جو بھی بہتے دریا سے اپنا چلّو بھرے یہ دریا اُس کا ہے
اپنی سب پاکیزگیوں کے ساتھ اُس کا ہے
چاہے اس پانی میں جیسے بھی جوہر ہوں
اچھے برے جوہر ، جو دریا کی سیّال حقیقت میں ، اک ساتھ پنپ کر
بجھ کر ، تپ کر ، یوں ظاہر ہیں—سب ظاہر ہیں
جس کی پیاس کو اس پانی پر حق ہو ،
اُسے بھلا کیوں شک ہو کہ ان قطروں میں مقّید ہیں وہ جوہر جو جیّد ہیں
دل میں پانی کی ٹھنڈک یہ کہتی ہے کہ طاب کا جو حاصل بھی ہے طیّب
ہے
ٹھنڈک پانے والا اسی یقین کے بل پر
اپنے گماں میں ، خوشیوں کی اس موج سے اپنی روح کے جوہر بھر لیتا ہے
جس کی چھلک اُس کی آنکھوں کے ڈوروں تک آتی ہے
کتنے چہروں پر ہے اپنے آپ میں کافی ہونے کی اک یہ کیفیت
اُن قدروں کی اچھی سی اک دین ، کہ جن کے مقدس دریا
سب گدلے ہیں

29 جون 1970

ہر سال اِن صبحوں کے سفر میں اک دن ایسا بھی آتا ہے
جب پل بھر کو ذرا سرک جاتے ہیں، میری کھڑکی کے آگے سے،
گھومتے گھومتے سات کروڑ کُرے، اور
سورج کے پیلے پھولوں والی پھلواڑی سے اک پتی اڑ کر میرے میز پہ
آ گرتی ہے، ان جنباں جہتوں میں ساکن!

تب اتنے میں سات کروڑ کُرے پھر پاتالوں سے ابھر کر اور کھڑکی کے
سامنے آ کر
دھوپ کی اس چوکور سی ٹکڑی کو گہنا دیتے ہیں، آنے والے برس تک

اس کمرے تک واپس آنے میں مجھ کو اک دن، اس کو ایک برس
لگتا ہے،
آج بھی اک ایسا ہی دن ہے
ابھی ابھی اک آڑھی ترچھی روشن سیڑھی، صدہا زاویوں کی، پل بھر کو،
جھک آئی تھی، اس کھڑکی تک!
ایک لرزتی ہوئی موجودگی، اس سیڑھی سے، ابھی ابھی اس کمرے میں
اُتری تھی
برس برس ہونی کے پرتو کی یہ ایک پرت اس میز پہ دم بھر یوں ڈھلتی ہے
جانے، باہر، اس ہونی کے ہست میں کیا کیا کچھ ہے،
آج یہ اپنے پاؤں تو پاتالوں میں گڑے ہوئے ہیں

25 جولائی 1970

سدا رہے یہ دھلا دھلا اور ستھرا ستھرا ،
زندہ ،
اپنے وجود کی اصلیت سے سنور ،
اس پر میل نہ رہنے پائے ،
اس کو گتھ دے ،
اس کو سل پہ پٹخ دے ،
اس کو توڑ مروڑ نچوڑ دے ، کس دے ،
اس کو جھٹک دے ،
اس کی گیلی شکنیں چن لے ،
اس کو سچے سکھ میں سکھا !

26 جولائی 1970

آج سحر دم میں نے بھی رک کر وہ جلسہ دیکھا ،

پکّی سڑک کے ساتھ ، ذخیرے میں ، ٹوٹی سوکھی شاخوں کے چھدرے
چھدرے سائبانوں کے نیچے
شیشم کے گنجان درختوں کے آپس میں جڑے تنے سب اس جلسے میں
کھڑے تھے

ایک گزرتے جھونکے کی جھنکار ذخیرے میں لرزاں تھی ،
"آس پاس کی کالی رسموں کے سب کھیت ہرے ہیں
اور یہ پانی تمھاری باری کا تھا
اب کے بادل دریاؤں پر جا کر برسے
ان سے تمھارا بھی تو عہد نامہ تھا
اب کیا ہوگا
چلتے آروں کے آگے چرتے گرتے جسمو
پاتالوں میں گڑ جاؤ—ورنہ"

اس تیکھی حجّت میں اتنی سچائی تھی
جتنے ان پیڑوں کے سب اک ساتھ ہلے غصے میں

اور میری آنکھوں میں پھر گئے دکھ اک ایسے خیال کے ، جس کی ثقافت
جانے کب سے اپنا مسکن ڈھونڈ رہی ہے

27 جولائی 1970

دل کا چھالا

پہلے آنکھ میں کڑوی سی اک لہر ،
اور پھر اک جرم
اور پھر ، یہ سب دکھ
سب دکھ ، اُس اک پاپ کی چنتا
سارے عذاب ضمیروں کو کجلانے والے
گہری کالک بھری دکھتی ریکھائیں جن کے الجھاووں میں عمریں بٹ جاتی ہیں
اک ہونی کے کتنے جنموں میں اس پاپ کا لمبا پھیرا پڑتا ہے ، دنیا کو دکھ سے بھر دیتا ہے

اچھا تھا جب دل کا چھالا پھوٹا تھا ، ہم اپنے قدموں میں رک جاتے

18 اگست 1970

عذاب

اپنے ثواب میں نیکی اپنے عذاب سے غافل رہ جائے ، تو
چھن جاتی ہیں جینے کی سب خوشیاں
ٹوٹ کے رہ جاتا ہے بھروسا اپنا ، اس نیکی پر
گھل جاتی ہے ، اپنے آپ سے نفرت میں ، اپنی ہر اچھائی

اپنے قلب کو اب کوئی چاہے جس قالب میں بھی ڈھالے
اب سب پچھتاوے ٹیسیں ہیں
اب دنیا کی آخری حد تک پھیلے ہوئے ان بادلوں کے نیچے یوں
پلکیں جھکا کر اپنے غموں کی پرستش بے مصرف ہے
باہر اب صرف آنکھیں دیکھتی ہیں—اور
باقی سارے بدن تیزابوں کے تالابوں میں تحلیل ہیں
آنکھیں دیکھتی ہیں ،—اور اس سے زیادہ کیا دیکھیں گی
سارے خداؤں نے منہ پھیر لیے ہیں

30 اگست 1970

اُن کی کنپٹیوں کے نیچے ،
کالی لمبی قلمیں ،
اُن کے رخساروں کے بھرے بھرے بھرپور غدودوں تک تھیں ،

تھوڑے تھوڑے وقفوں سے وہ زرد گلاسوں کو ہونٹوں سے الگ کرتے......اور
پھر دھیمی دھیمی باتیں کرتے اپنی نئی نئی اُن داشتاؤں کی
جن کے نام اور جن کے نرخ اس دن ہی اخباروں میں چھپے تھے

7 ستمبر 1970

اپنے بس میں تو ......

اپنے بس میں تو بس اتنا کچھ تھا اور وہ بھی سب ، تیری خاطر

اس دل نے اپنائی ، عمر بسر کرنے کی اک یہ نہج بھی تیری خاطر
اپنی انا کی بھینٹ ، تیری خاطرتھی
نطق پہ مہریں تھیں سب ، تیری خاطر
تیرہ ضمیروں سے گزرا ہوں ، گلیوں کی دیوار سے لگ کر ، تیری خاطر
نخوت کے بازار میں میرے جسم پہ ٹھنڈی ہوا کی ردا بھی ، تیری خاطر

شام کو جب ان دو شہروں کو ملانے والی ، لمبی سیدھی ، دوھری سڑک پر
اتنے دیوں کی دوگانہ صفیں اک ساتھ جلی ہیں
ان کی نیلی نیلی ، پیلی پیلی لووں کو اپنے جی میں اتار کے ،
آنکھیں میچ کے ، تجھ کو یاد کیا ہے ، تیری خاطر

اے وہ ، میرا سر جس کے نادیدہ پنجے میں ہے ،
جس کی انگلیاں میری کنپٹیوں میں گڑی ہوئی ہیں
جانے میری ہی کس کیفیت میں
مجھے پٹخ دینے کو !
اب میں کیسے پلٹ کر دیکھوں ، اب میں کیسے تجھے بتاؤں
اب بھی گرم ہے راکھ ، مرے قدموں کے نیچے ، میرے دل کے بجھے ہوئے سورج کی

12 ستمبر 1970

کچھ ایسی آ گیں میرے آگے بھی تھیں
میرے گرد بھی آپس میں جکڑی ہوئی جلتی لپٹوں کے کچھ ایسے ہی جنگلے تھے ،
جن سے باہر دور اُدھر وہ پھول نظر آتے تھے ، جن پر میرے چہرے کی زردی تھی ،
میں بھی کہتا تھا——اور میں اب بھی کہتا ہوں——
اک دن شعلوں کی یہ باڑ بجھے گی......
اک دن اُس پھلواڑی تک ہم بھی پہنچیں گے، جس کی بہاریں ہماری روحوں میں ڈھلتی ہیں !
اور میں تو اب بھی آپس میں اُلجھی ہوئی لپٹوں کے اس جنگلے میں ہوں جس میں تم ہو......
فرق اتنا ہے تم نے ابھی آگیں ہی دیکھی ہیں ،
تم نے ابھی ان جلتی جالیوں سے باہر نہیں جھانکا......
ابھی تو ان شلعوں کی نوکیں تمہارے سینوں میں پیوست ہوئی ہیں
اور تمہارے ذہن میں تازہ لہو نے غُصّہ بھری اک چٹکی لی ہے !

ورنہ تو——میں اور تم اور سب آدمی باری باری انھیں چتاؤں میں جل جل جائیں گے ،
جن کی لپٹیں ہمارے گرد اک جنگلا ہیں......

21 ستمبر 1970

صبح کی دھوپ اُن پھولوں کا دفتر تھی ، جس میں روز اُن کی مسکراہٹ
کی حاضری لگتی ،
شام کے سائے ، ان کی نیندوں کے آنگن تھے ،

صبح کو ہم اپنے اپنے کاموں پر جاتے ، تو اس سبز سڑک کے موڑ پر
تازہ دم پھولوں کے رنگ برنگے تختے ہم سے کہتے :
”کرنوں کا یہ دھن ، سب کا ہے ، سب کا
جیو جیو ، سب مل کر ، سنگت سے ہے رنگت !“

پھر جب دن کی روشنیاں تھکتیں تو اُس موڑ پہ ، نیندیں اوڑھ کے سہمے
ہوئے وہ پھول ، یہ ہم سے کہتے
”سب کا بیری ہے یہ اندھیرا
جلد اپنے اپنے اینٹوں سے چُنے ہوئے سپنوں میں پہنچو
اچّھا ، کل کو ملیں گے ، کل کو کھلیں گے !“

لیکن اب وہ تختے اجڑ گئے اور اب اس کوٹھی کے دروازے پر
چکنی بجری ہے ، اور تھر کتے چمکیلے پہّیے ہیں ۔

صاحب ، تم نے تو اتنا بھی نہ دیکھا
یہ سب پھول تو خوشیاں تھیں ، محنت کش خوشیاں
اور یہ لاکھوں کا حصہ تھیں
تم نے تو اتنا بھی نہ سوچا
ارے ہم لوگوں کی راحتِ حق کی خاطر لڑنے والے وکیلِ جلیل

30 ستمبر 1970

کبڑی پیٹھ اور پتھرائی ہوئی آنکھوں والے ، رک رک کر ادھر اُدھر
بے بس نظروں سے دیکھنے والے
بوڑھے بھک منگے ، اس اپنی حیرانی کے فریضے میں تُو واقعی کتنا حیران
نظر آتا ہے -
جانے کس کے ارادے کی رمزیں اس تیری بے بسی کی قوت ہیں
پتھریلی روحوں کے صنم کدے میں جانے کون یہ کاسۂ بدمست کھڑا
ہے !

تجھ کو دیکھ کے میرا دل اس سے ڈرتا ہے
تیرے ڈرے ہوئے پیکر میں جس کی بے خوفی جیتی ہے
کس دھیرج سے دھڑکتا ہوگا اس کا قلب کہ تُو جس کا قالب ہے
اتنے سکون مبں جتنے قصد ہیں ، میں اُن سے ڈرتا ہوں -

تیرے وجود کو یہ بے کل پن دے کر کس بے دردی سے ، وہ
دلوں میں سچی ہمدردی کے درد جگاتا ہے ، اور ہم کو ترساں دیکھ کے
شاید خوش ہوتا ہے

ابھی ابھی تو یہیں کہیں تُو میری غفلت میں تھا
اب کہتا ہوں ، مجھ کو میری آ گاہی میں ، کب یہ بھیک ملے گی -

4 اکتوبر 1970

اچھے آدمی

اتنی اچّھی صفتیں بھی تُو نے اپنالیں ، اچّھے آدمی
اور ان صفتوں کی سب تقدیسیں بھی سچّی ،
اور ایمان کی اک وہ زرہ بھی اچّھی ،
جس کو پہن کر تیرا دل اتنا مضبوط اور اتنا طاقت ور ہے ،
اس دنیا اور اُس دنیا کی سیاہ ہوائیں سب اس سے ٹکرا کے پلٹ جاتی ہیں ،
اس ٹکراؤ میں تیرا سینہ خم نہیں کھاتا ،
اور اس فتح پہ شرمائی ہوئی اک عظمت تیری آنکھوں میں بھر جاتی ہے
اور سانسوں کی کھچی لگاموں کے اندر اک رکا رکا موّاج سمندر
تیرے دل میں اُمڈ آتا ہے ،

اس سے زیادہ اور تجھے کیا چاہیے ، بندے ،
چاہے تُو ہر اس سچّائی کو اپنی نظروں سے گرا دے
جو تیرے پندار میں کم رفعت ہے !
اس سے زیادہ توَ اب حجم نہیں بڑھ سکتا ، اس شفّاف چٹان کا ، جو
اس تیرے سینے میں ہے ،

اپنی جگہ تو ایک الوہی سی یہ شکم سیری اچھی ہے، لیکن ، اچھے آدمی ،
آخر کوئی خلا تو روح کی خالی بھی رکھ ،
ہم جیسوں کی اُفتادوں کے حق میں

9 اکتوبر 1970

اوروں کی کیا کہیے ، خود میرا دل بھی انگاروں کا مطبخ ہے ،
سدا مری آنکھوں میں اک وہ کشش دہکتی ہے ، جو
سب کو اپنی جانب کھینچ کے میرے وار کی زد میں لے آتی ہے ،

سب کچھ میری طلب کی تشنگیوں کے دہانے پر ہے ،
انگاروں کے اس مطبخ میں گرنے کو ہے ،

گاڑھا ، لجر ، لہو ، اک وہ کیلوس جو انگاروں کا استحالہ ہے ،
اس میرے دل کی کالی قوّت ہے ، میں جس کے بس میں ہوں ،

یہ قوّت مجھ سے کہتی ہے :
"دیکھ ، مرے انگارے ، میری تڑپ کا انگ ہیں ، اب کچھ تو ان کی خاطر بھی"

اور انگارے اگلتی سانسوں کے ساتھ اب مَیں ،
اس دنیا کے اندر ، اپنے شکار کی تلاش میں ،
اک اک روح کی گھات میں ،
اک اک روح کے سامنے ، سوالی بن کے کھڑا ہوں
میرے دل کے انگاروں کے دندانے پیہم جڑتے اور کھلتے ہیں
باہر کسی کرم کی بناوٹ میں ہونٹ ایک انوکھا ٹھہرا ٹھہرا ٹیڑھا زاویہ سا ہیں ،
کون مجھے اب پہچانے گا ،
کس طرح ہنس ہنس کر مجھ سے ملتی ہے دنیا ، بد بخت !

10 اکتوبر 1970

دکھ کی جھپٹ میں آئے ہوئے دل ،

اب کہتے ہو ،
اس دن دکھ کی جھپٹ میں آئے ہوئے کچھ لوگوں کی فریادوں کو قرب
اس موجودگی کا حاصل تھا
جس کے ہونے کو اس دن تم نے ہی دیکھا اور نہ ان لوگوں نے ،

اے دل ، اب ان لوگوں کی منزل میں آ کر تم سمجھے ہو ،
ورنہ تم کہتے تھے ان کی کون سنے گا ،
اور خود ان کو بھی یہ خبر نہیں تھی اُس دن کس کے قرب میں تھے وہ ،

اب کہتے ہو ، اب ، جب
تم یہ دیکھتے ہو کہ تمھاری ان فریادوں سے باہر ہے وہ موجودگی
اب تو ان کو تلاش کرو جو اک دن اس کے قرب میں تھے اور جن کو
اس کے قرب کا علم نہیں تھا

23 اکتوبر 1970

کب کے مٹّی کی نیندوں میں سو بھی چکے وُہ،
میری نیندوں میں اب جاگنے والے،

ابھی ابھی تو میری دنیا، سوئی ہوئی تھی،
اُن کی جاگتی آنکھوں کے پہرے میں،
ابھی ابھی وہ یہیں کہیں تھے، میرے خوابوں کی عمروں میں،
ابھی ابھی اُن کے مٹیالے ابد کی ایک ذرا سی ڈلی گھُلی تھی
ان میری آنکھوں میں،
اور دکھائی دیئے تھے، میری خود بیں بنیائی میں،
وہ سب ٹھنڈے ٹھنڈے سکھ، جو
اُن کے دلوں کا اُنس اور پیار تھے، میرے حق میں!
ابھی ابھی تو اس میری بے فہمی کی فہمید میں تھا یہ سب کچھ،

اور اب، میرے جاگنے میں سب کھو گئے وہ میری نیندوں میں جاگنے والے!

28 اکتوبر 1970

جاگا ہوں تو جاگتی آنکھیں کہنے لگتی ہیں : "یہ سب سپنے اپنے ہیں"
جیسے میں ہی تو ہوں اپنے ہر سپنے میں ،
میں ہی تو ہوں اپنی جاگرتی میں ،
نیندوں کے اندر بھی ، نیندوں کے باہر بھی ، جو جو سمے گزرتے ہیں
وہ میرے ذہن میں سب ڈھلتے ہیں ،
دنیا کا ہر اک دن میرے ذہن میں ڈھل کر اک اور دن ہے
جیسا آج کا دن تھا
رات کو نیندوں میں کچھ اچھے اچھے لوگ ملے تھے ، اُنہی چھتوں کے نیچے
جن کی دیواریں اب ، کب کی ، گر بھی چکی ہیں
دن کو میرے جاگنے میں کچھ اور ہی میلی میلی روحیں میرے ساتھ رہی ہیں
روحیں ، جن کی اونچی چھتوں کے نیچے میرے وجود کی دیواریں ہیں ،
کیسے کیسے نگر ہیں یہ جو تیرے روز و شب کے پھیرے میں پڑتے ہیں
کیسی کیسی اقلیمیں ہیں میرے دل کے کوٹھے کے اندر ، جو ڈھے بھی چکا ہے

آج تو جب سے جاگا ہوں ، اپنی بابت اتنا کچھ سمجھ سکا ہوں
کالی گلیوں کی دھوپ اپنے چہرے پر مل کر یہ دنیا والوں سے ملنے والا
مر بھی چکا اب ، اپنی نیندوں میں جینے کی خاطر ،

13 دسمبر 1970

جانے اصلی صورت کیا ہو، ذہن کی اُس اک رو کی،
جس کے ساتھ بہا کی میری سوچ اور میری عمر اور میری دنیا،
بہتے بہتے یوں تو جب بھی دیکھا ہے، میرا دل اک وہ قوت تھی،
جس کے آگے پہاڑ بھی تنکا تھے، یہ سب کچھ تو تھا،
لیکن سدا یہی میں سمجھا، سدا رہا میں اس پشیمانی میں،
اک یہ دراڑ جو میرے پیہم دماغ میں ہے کون اس کو پھلانگ سکے گا،
اک یہ دراڑ، کہ جس کے ادھر ٹھٹک کر رہ جاتے ہیں سارے خیال اور سارے ارادے
جس کے ادھر میری ذلت ہے
جس کے ادھر میں اک بے بس قوت ہوں
اک یہ دراڑ کہ جس کے ورے وہ مقدس آگ ہے جس کی لو میں کلیوں کی برکھا ہے،
اک یہ دراڑ جو میرے پیہم دماغ میں ہے کب اس کو پاٹ سکوں گا،
اپنی حدوں کی حد سے آگے کب یہ قدم اٹھے گا،
آگے، جہاں وہ سرشاری ہے جس کی کشید بھی اس میرے ہی ذہن میں ہوتی ہے

15 دسمبر 1970

ان سب لاکھوں کروں، زمینوں کے اوپر

ان سب لاکھوں کروں زمینوں کے آوپر لمبی سی قوس میں یہ بلوریں جھرنا جس کا ایک کنارا، دور ان چھتناروں کے پیچھے، روشنیوں کی ہمیشگیوں میں ڈوب رہا ہے

جس کا دھارا میرے سر پر چھت ہے
اور میں اس پھیلاؤ کے نیچے
کبھی نہ گرنے والی، گرتی گرتی چھت کے نیچے،
ریزہ ریزہ کرنوں کے انبار کے نیچے
اپنے آپ میں سوچوں
ایسی شامیں تو جگ جگ ہیں
آگے تو جانے کیا کچھ ہے
لیکن ان سب ہوتے امروں کے ریلے میں
کہیں کسی امکان، ذرا سے اک امکان کی اوٹ ایسی بھی تو ہو،
جس میں سمٹ سکے یہ میلی میلی سی چھت
اور یہ اُترے پلستر والی بوسیدہ دیواریں
جن کی کھڑکیاں میرے دل کی طرف کھلتی ہیں

31 دسمبر 1970

اپنے اندر جو کندن ہے اس کا لشکارا تو سدا ہماری آنکھوں میں جیتا ہے ،
سدا ہمارے ذہن میں اک چمکیلی راحت کے لالچ کو اکساتا ہے

لوگ ، جب اپنے مطلبوں کی خاطر ، یوں عجز کی باتیں کر کے ، ہم کو
عاجز کر دیتے ہیں
تو ایسے میں ہمارے اندر جو کندن ہے ، ہماری آنکھوں میں آ کر
ایک لجاجت بھری ہنسی ہنستا ہے ،
اسی ہنسی کے پیچھے تحفظ کا اک ان دیکھا پنجہ بھی جھپٹتا ہے اور
نظر نہ آنے والا ایک تصرف کا جبڑا بھی غراتا ہے ،

یہ سنگین و ملائم ، رمز مروت کی ، سارے مفہوم ادا کر دیتی ہے—اور
اس کے پردے میں ، گہرے بھیدوں کے اندر ، زندگیوں کی حفاظت
کرنے والی خود غرضی جیتی ہے
اس سچے لشکارے والے کھوٹے کندن کی ضو
سدا ہماری آنکھوں میں جیتی ہے ،
اور—اس پر ہم کتنے خوش ہیں

۲ جنوری 1971

جب اطوار وطیرہ بن جاتے ہیں

جب اطوار وطیرہ بن جاتے ہیں
اور لوگوں کے عمل میں جب اک رسم کا رس گدلا جاتا ہے ،
تب روحوں کو چیرنے والے تقاضے
ہوتے ہوتے ، اپنے اعادے کے اندر ہی خود اپنی تکذیب میں
سٹ جاتے ہیں
تب اچھے عملوں کی تعمیلوں میں اچھے عمل دھندلا جاتے ہیں ،
اور وہ سارے ظلم جنم لیتے ہیں ، جو ہم روز روا رکھتے ہیں !

کون بتائے ، کتنے ظلم ہیں ،
جو ان معمولی معمولی باتوں کے معمول میں یوں ہم سے سرزد ہوتے ہیں

جیسے ، پتلیاں آنکھوں میں بے بس ہو ہو کر اپنے آپ پہ جم جائیں ، جب
تھکے تھکے دل کے ، پیچھے اپنی کچھ اوچھی سوچیں ، چلتے چلتے
آستینیں الٹا دیں ،

جیسے ، دل کو سیدھی راہ پہ لانے کا عندیہ ،
بے دھیانی میں ، داڑھ تلے پس جائے ،
جیسے ، جی کو دکھانے والی چیزیں سامنے آ آ کر
بے حس نظروں کا روزینہ بن جائیں

6 جنوری 1971

تُو۔۔۔وہ پیاسی توجہ ، سدا رہی تھی کبھی جو میری طرف ہی
کیا دن تھے ، تیرے ہونے میں سپنے تھے میری خوشیوں کے ،

اور اب میرے دل کے متصل ہیں وہ فاصلے ، جن کا کنارا دور اُدھر تیرے
دل کی حد تک ہے
اور یہ فاصلہ بھی تو ہے اس زندگی میں اک موت کا رابطہ ،

اب اس موت میں جینے سے کیا حاصل ،
اس لمحے تو ساری دنیا ، میرے دل کے
اک لا حاصل سے احساس کا حصہ ہے ، اور
یہ سب تو شاید......
خود اپنی ہی طرف میری وہ توجہ ہے ، جو اب کے ہوئی ہے ،
اب جب سارے فاصلے زندگیوں کا فیصلہ بھی کر چکے ہیں

10 فروری 1971

اور وہ بھی اک کیسی محویت تھی ، جس میں سدا صدہا آنکھوں نے اٹھائے
اپنے نازک پردوں پر بوجھ اُس موسیقی کے ، جو روحوں میں لہرا جاتی ہے !

اور پھر اک وہ محویت بھی دین تھی کیسی کیسی آسودہ شاموں کی ،
ان گلیوں میں کیسے کیسے لوگ تھے ، جو یوں اپنے دلوں کے گمانوں میں
جیتے تھے ،
اک لمحے میں ابد کو دیکھنے کا احساس عجب اک مستی تھی ، وہ جس
کے گمانوں میں جیتے تھے !

اُن کو اس خبر کی نہیں تھی ، یہ گہری محویت
موجِ ابد سے کٹ کر گرا ہوا وہ ساکت لمحہ ہے ، جس کے ٹھہراؤ میں
رک جاتے ہیں ،
وہ سب ذکر کہ جن کو جاری ہی رہنا ہے ،

باہر دیکھو...اس دوّار حقیقت کی جوکھم میں جو بھی پڑا ، اس کی آنکھوں
میں تو بھر بھر گیا بوجھ اس ذکر کا ،
جو مٹی میں مل کے مٹی نہیں ہوتا
سنبھلو...سوچو...تم کس محویت میں محو ہو ، لوگو ،
اپنے ذہن سے خود کو جھٹک کر ، اپنے باہر دیکھو

11 فروری 1971

میرے اپنے ظلم اور میرے اپنے کفر کے آگے ، مجھ میں یہ جو عاجزیاں ہیں
ان سے ملوّث ہے میری ہستی

میں نے چاہا تھا ان عاجزیوں کی جگہ پر اک سنگین طمانیت اپنے سینے میں
رکھ لوں
جس میں نئی نئی کڑواہٹ کی خوشیاں ہوں
میں نے کچھ یہ مہم سر کر بھی لی تھی

لیکن چلتے چلتے ذرا سا ایک خیال آیا ہے ، پھر کالی سی اک برگشتگی
میرے ذہن میں چکرائی ہے -
اور میری پلکوں کی ڈوریاں ڈھلک گئی ہیں ،
میرے مردہ دنوں کی کھوپڑیوں سے ظلم اور کفر کی میٹھی نظروں نے
پھر سے میری جانب جھانکا ہے !

بیتے دنوں والا یہ چہرہ ،
اس چہرے کو ، اس چہرے کی آنکھوں کو میں بھلا بھی چکا تھا
ان آنکھوں کو اپنے جذب اور اپنی کشش کا علم ہے
اور پھر اُن کے اس علم کے آگے میری خود آگاہی ماند ہے
اس طغیان کے آگے اب پھر عاجز ہوں اور اب پھر
بہ صد خوشی اس اپنی عاجزی کے آگے بے بس ہوں ،
مجھ سے پوچھو ، اپنی غرقابی کے اس احساس کی سطحیں بھی کتنی
دل کش ہیں !

20 جنوری 1971

پچھلے برس جب یہ دن آئے تھے......

پچھلے برس جب یہ دن آئے تھے ، —دن
جو اس سال اب بھی آئے ہیں
جب یہ بادل ، جب یہ کہرا ، جب یہ سرد ہوائیں
جب یہ سب کچھ تھا جو اب کے برس ہے
تب تو میرے ساتھ اک اپنے آپ کے گم ہو جانے کی آگاہی بھی تھی
تب تو بادل بھی اس پگڈنڈی پر دھول تھے جس میں میرے پاؤں
کھبے ہوئے تھے
تب تو ، میں اور یہ بستی ، اور یہ پگڈنڈی ، بادل ہی بادل تھے ،

آج اس پگڈنڈی پر چلتے ہوئے وہ اک دن یاد آتا ہے ،
اس دن بادل میرا پہناوا تھے
میں جب میلی سی اک صبح کی تنہائی میں ادھر سے پچھلے برس گزرا تھا

آج بھی ، بادل—گیلی گیلی تہوں میں ڈھیر دھوئیں کے ، اِدھر اُدھر ہر سو ہیں
ڈھیر دھوئیں کے ، قوسوں سے قوسوں تک ، کھیتوں میں ، کچی دیواروں پر
صرف اک میرا دل ان سے خالی ہے ،
کیسے کیسے ابد جو بیت گئے ہیں

30 جنوری 1971

میرے سفر میں......

میرے سفر میں ، اک اک دن کا سورج ، اک اک دیس تھا ،
ان دیسوں کے اک اک باسی کے دل سے گزرا ہوں ،
میں نے دیکھا ان کے دلوں کے آنگن سونے کے تھے
ان کی مگن آنکھوں میں ڈورے سونے کے تھے ،
اک اک صبح کو اُن کی سواری کے لیے آتی تھی سورج کی رتھ ، سونے کی

لیکن آج یہ جس پر میری نظر رکی ہے، کون ہے یہ مٹی کا پتلا، ان سڑکوں پر،
جس کو دیکھ کے میرے جی میں بھر گئے ہیں وہ آنسو ،
آنسو ، جن کے سبب سے سونے کے وہ سب زنگار جو میرے عقیدوں پر
تھے ، اتر گئے ہیں

اور اب یہاں کھڑا ہے ، میرے سامنے ننگے پاؤں وہ مٹی کا پتلا کیچڑ میں ،
کرنوں کے کیچڑ میں
اک وہ ، جس سے اُس کے دیس کے سارے سورج ہم نے چھین لیے ہیں

اور میری نظروں کے سامنے اپنے کرموں کے کیچڑ میں ، لتھڑی ہوئی
نظر آتی ہیں
ساری ملّتیں جواب تک ان دنوں کے دیسوں میں آئی ہیں ،
میرے سینے کے اندر اک چھوٹا سا کوٹھا گر پڑتا ہے اور
اک چھوٹے سے خیال کی دنیا ان میری آنکھوں میں اُمڈ آتی ہے ،

اور میرا دل مجھ سے پوچھتا ہے جانے ہم اپنی روحوں میں کب اِس
سورج کو
ابھرا ہوا دیکھیں گے ،
وہ سورج ، جو اب تک کبھی نہیں ڈوبا

3 مارچ 1971

ننھے کی نو بیں آنکھوں میں تارا.....

ننھے کی نو بیں آنکھوں میں تارا ،
اپنے اندر ، ساری دنیا کے عکس ، اب بھی ، اسی طرح ، لے کر آتا ہے ،
جیسے کروڑوں برس پہلے کے بچے ،
بچے انسانوں کے ، بچے جانوروں کے ، سب لے کر آتے تھے ،
اپنی آنکھ کے تل میں ،

اب بھی کوئی چڑیا چشمہ نہیں لگاتی

اب بھی نو بیں آنکھوں والی کھلنڈری ننھی ننھی نئی نویلی نسلیں
دیکھتے دیکھتے، دور ، ان چوراہوں پر سے،
صدہا پہیّوں کے جنباں رخنوں کے اندر ، اپنے چلتے پیڈلوں ، ڈولتے ہینڈلوں
کے ساتھ
کس تیزی سے گزر جاتی ہیں
میرا دل ، میری عینک کے منفی هندسوں والے شیشوں کے پیچھے حیراں ہے
میں جو بمشکل بہتے ہجوموں کے ساحل پر اپنے اوسانوں کو سنبھالے
ہوئے ہوں ،
کون اس جانب دیکھے گا ،
جس جانب میں ہوں ،
جس جانب سب نے جانا ہے !

16 مارچ 1971

کہنے کو تو ہم سب جانے کیا کچھ ہیں...
جتنے ذریعے خیر کے ہیں، ہم اُن کی جانب کہنے کو تو بڑھتے ہیں ،
کس کا کلیجہ ہے دنیا کی دیکھتی آنکھوں کے آگے
اپنے دل کی بدی کی سمت بڑھے ،
لیکن ، تم نے دیکھا ، جب بھی چکنا چور ضمیروں والے ساجوں میں
کوئی خیر کی منزل سامنے آتی ہے
تم نے دیکھا ، کیسی کیسی اپاہج نیکیاں اپنے بجتے جبڑوں کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں
دیکھنے میں تو اتنے سیدھے صراطوں پر چلنے والی...
اور جب اُن کی آنکھوں کے رستے اُن کے دلوں میں گزر کر دیکھو ، تو اندر... گھات لگائے ، اُن کے ضمیروں میں مضمر ہیں وہ سب تیز نگاہوں والے کالے ارادے ، جو
موقع پا کر ، ہر منزل پہ جھپٹتے ہیں ،
روحوں میں جم جانے والے سیسے کی خاطر...

14 مئی 1971

میں کس جَگ مَگ میں تھا اب تک......
کہاں تھا اب تک اک یہ خیال کہ جس کی روشنی میں آج اپنی بابت سوچا ہے ، تو
خود کو اک ظلمت کی منزل میں پایا ہے......
جو بھی اچھائی ہے ، مجھ تک آتے آتے میرا عیب ہے ،
رستے جہاں پر سب آ کر ملتے ہیں ، منزل ظامت کی ہے میں جس میں ہوں
میں......جو اپنی بے سرو سامانی میں تیرے ذکر کا اہل نہیں ہوں،......

اندیشوں سے بھرا ہوا یہ سر تو کھڑ کھڑاتی ہوئی مٹی کا اک ٹھیکرا ہے ، جو
تیرے قدموں پر جھک جائے ، تو بھی
تیری جلالت کا رتبہ نہیں بڑھتا ' جو پہلے ہی اوج مراتب پر ہے ،
وہ سب رستے تیرے علم میں ہیں ، جو
میرے دل کی ظلمت پر آ کر ملتے ہیں ،
اور جو تیری صداقت کے سرچشموں سے پھوٹے تھے ،
صدہا سمتوں سے آنے والے ان رستوں کے پیچھے
روشنیوں کے اَبَد ہیں

......جن کی اوٹ میں آگے ظلمت کی منزل ہے ، میں جس میں ہوں......
باقی سب دنیا اب بھی اُس جگ مگ میں ہے ، جس سے ابھی میں باہر آیا ہوں

29 مئی 1971

جب اک بے حق استحقاق کے بل پر،.....راحت کی اک دنیا،
جینے والی روحوں کے عفریتوں کے حصے میں آ جاتی ہے ،
تو اک مشکل ابھرتی ہے ، عمروں میں اُن خوشیوں کا دور آتا ہے ،
جن کے تقدس کو زندہ رہنے والی سب اچھی قدروں نے تسلیم کیا ہے ،

ایسے میں اب آخر کوئی کتنا بھی سچّا ہو ، کیوں وہ الجھے اُن لوگوں سے ،
جن کی اک اک سانس محافظ ہے اُن کی جھوٹی راحت کے اس قلعے کی ،

آخر دنیا تو یہی کہتی آئی ہے یہ راحت اک وہ حق ہے جو سب دستوروں کا ثمر ہے -
اک وہ حق ، جس کی خاطر ہر فرد اپنے ہونے کی میٹھی سزا چکھتا ہے -
سب کچھ بھول کے اپنی ہستی کی سرمستی میں جیتا ہے -
لیکن اپنے حق کے جواز کی بابت کچھ سوچے تو اس کی سوچ میں سیسہ بھر جاتا ہے
اس کی آنکھوں اور چہرے پر اک ٹھنڈی پتھریلی چمک بکھر جاتی ہے

کون اس حق سے الجھ سکتا ہے ، کون اسے جھٹلا سکتا ہے ،
میں نے دیکھی ہے ، جو کچھ اس حق سے ٹکرانے والی حُجّت کی سزا ہے !

میں کہتا ہوں ، پھر بھی دل کو چیرنے والا اپنا یہ دُکھ اچھّا , اُس راحت سے ،
جس میں اک دنیا کو سہارا دینے والی غمگیں نیکیاں سب گہنا جاتی ہیں

2 جولائی 1970

اپنی بابت تو ہم تم یہ جانتے ہیں......

اپنی بابت تو ہم تم یہ جانتے ہیں کہ ہماری منزلت اور ہمارے منصب
مٹی کے رشتے ہیں ،

لیکن میں کہتا ہوں : یہ جو سارے ادارے ، یہ جو ساری تنظیمیں اور
تملیکیں ہیں ،

یہ سب جگہیں کتنی تکریموں والی ہیں ،
جو بھی قوت کے ان سرچشموں پر قوت حاصل کر لے
اُس کے بس میں ہے ان دلوں میں وہ تقدیریں بھر دے
جن میں لاکھوں انسانوں کے ضمیروں کی خوشیاں مضمر ہیں !

لیکن اب ان جگہوں پر جن لوگوں کے پنجے ہیں
کیسے اُن کے ارادوں کے قبضے اُن کی سانسوں پر کسے ہوئے ہیں
اور کتنے آسودہ ہیں وہ اپنے عزم ستم پر...

بندے ، جانے وہ دن کب آئے گا
جب یہ لوگ بھی جانیں گے کہ سبھی یہ اُن کے منصب مٹی کے رشتے ہیں
وہ دن ، جس کے تقدس کے آگے ہم نے ہمیشہ اپنے آپ کو بے قوت
پایا ہے !

10 جولائی 1971

آنکھیں ہیں ، جو مجھ پہ گڑی ہیں ،
چہرے ہیں ، جو میری جانب جھکے ہوئے ہیں ،

آنکھیں ، جن کو دیکھ کے میرے دل کے تختے دھڑکنے لگ جاتے ہیں ،
چہرے ، جن کے آگے میری روح کے بادباں ڈول جاتے ہیں ،

آنکھیں گردابوں کی ،
چہرے طوفانوں کے ،

اور یہ سوجیں
یہ دشمن آنکھوں والے عفریتوں اور اُن کے چکراتے وجودوں کے پیچاک ،
ابھرتے
بڑھتے ، میری سمت اُمڈتے

سب کچھ ، ایک ذرا سی جنبش اُن سرشار ہواؤں کی ، جو ازل سے ابد تک بہتی ہیں ، اور
جن کی لگامیں ، ایسے ہاتھوں میں ہیں ، جن کی ہتھیلیوں پر ، یہ سارے سفینے ہیں روحوں کے !

بجتے تختے ، ڈولتے بادباں ، اور ڈر اس کا ، جس کا سہارا ہے

27 جولائی 1971

دنیا ، تیرے اندر سچائی کی وہ سب طاقت ہے ، جو کروڑوں جینے والے
جاننے والے ذروں سے مل کر بنتی ہے

جانے ، تیرے اندر کیسی کیسی رمزوں کی طاقت ہے ،
اتنی طاقت ہے تیرے پاس اور تو کتنی بے ہمت ہے !

میں جوآزادی کی اک انگڑائی بھر کر اتنے کالے جنگلوں سے نکلا ہوں
مجھ پر تیری آنکھوں کے انگارے کیوں ہنستے ہیں
میں جو اپنے ساتھ اتنے لمبے عرصے سے جنگ میں ہوں اور میں ، جو
اپنے آپ سے صلح پہ اب بھی کچھ آمادہ نہیں ہوں
تیرے لبوں پر میرے لیے اتنی زہریلی شفقت والے بول یہ کیوں ہیں

تیری اپنے ساتھ جو جنگ تھی تو نے ہار بھی دی اور مجھ کو اس حالت
میں دیکھ کے
اب جو طمانیت تیرے اندر سے چھلک کر تیری آنکھوں اور چہرے پر
بکھر گئی ہے
مجھ کو دیکھ کے ، مجھ پر اپنی فوقیت کا یہ احساس کہ جو تیرے دل
میں امڈا ہے
کیا سب اسی لیے تھیں وہ رمزیں جن کی طاقت تیرے بس میں ہے !

یہ میری نادانی ہے نا ، اپنے آپ سے اب بھی جنگ میں ہوں اور اب بھی
اپنی گراوٹ سے لڑتا ہوں

دنیا ، تیری جامد عظمت ، مجھ کو دیکھ کے ، آج اس قہقہے میں کیوں پھڑ پھڑائی ہے

اس سے زیادہ بھلائی تیرے ساتھ میں کیا کر سکتا ہوں

28 جنوری 1971

اب تو دن تھے......

اب تو دن تھے ،
یہی تو دن تھے ،
دن جو اک اک شخص کے حق میں جدا جدا تقدیر ہیں ،
جانے ، میرے دنوں کا فیصلہ کیا ہو میرے حق میں ،
لیکن پھر بھی یہی تو وہ دن ہیں ، جن کی پتھریلی تھاہ میں مل جاتی ہے ،
غوّاصوں کو ،
دولت ،
دولت بھی ، ایسے حرفوں کی ،— جن کے سانچوں میں اسموں کے ابد ڈھلتے ہیں !

اب تو دن تھے ،
پھر تو......
پھر تو یہ ذلت تک بھی باقی نہ رہے گی جس میں میری آسائش مجھ کو زندہ رکھتی ہے
اب تو دن تھے ، میرے دل میں بسنے والی بڑی پرانی بے دلی !
تو اک بار تو میرے قلم کو اپنے بھید عطا کر دیتی ،
پھر تو ریت کی چادر ابھرے گی اور ڈھانپ دے گی ان زخموں کو ، جو تیری مسکراہٹ نے مجھے بخشے ہیں !

22 اگست 1971

سب کچھ جھکی جھکی ان جھونپڑیوں والے میرے دل کے گاؤں میں ہے، جو میری ان پلکوں کی چھاؤں میں ہے جب یہ پلکیں میرے دل کی جانب جھکتی ہیں،

باہر، لاکھوں زندگیوں کے قبیلے،
بازو جھٹک جھٹک کر کوسنے والی نفرتیں
کالے جنگل، جن کی جڑیں سب میرے سینے میں ہیں،

باہر... مینہ برسا ہے
باہر... چھتناروں کے دھلے دھلے پہناوے، گیلی گیلی دھرتی اور چمکیلی سڑکیں

اور اندر، میرے کمرے میں دیواریں مجھ سے کہتی ہیں:
"آج ہمارے پاس بھی بیٹھو...
ہم نے بھی تو دیا تمہیں یہ دل، یہ گاؤں کہ جو اس لمحے
تمہاری ان پلکوں کی چھاؤں میں ہے..."

24 اگست 1971

ان کے دلوں کے اندر تو نہیں......

ان کے دلوں کے اندر تو نہیں ، لیکن ان کے مکانوں کے اندر تو دیکھو ،
کتنی ویرانی —جس سے ان کے دل بے وقعت ہیں—
کتنی ویرانی—جس سے ان کے چمکیلے آنگنوں کی رونق ہے...
چھوٹے بڑے لوگ ، ان شہروں کے ، اپنے چھوٹے بڑے مکانوں میں
سب اک جیسے ہیں
دیواروں سے پھسل کر آنگنوں کی ڈھلوان تکونوں تک جو دھوپ اُتری ہے ،
سب زردی ہے چہروں کی ان شہر والوں کے ،
اپنے آپ سے اکتائی ہوئی سب عاجز خوشیاں ہیں جو چہروں اور آنگنوں پر پھیلی ہیں ،

باہر... کھو کھلے قہقہے ، جن میں ٹین کی روحیں بجتی ہیں...
اندر... کچھ کاٹھ کی راحتیں ، دیمک کے جبڑوں میں...

24 اکتوبر 1971

بندے ، جب تو اپنی سوچ میں......

بندے ، جب تو اپنی سوچ میں کوشاں ہوتا ہے اس زندگی کے لیے
جس کی خاطر ، تیری روح ڈکارتی ہے تیرے دل کی دھڑکن میں :
ٹھنڈے میٹھے پانی ،
سانس میں روغنی باس .....اور
اینٹوں کی عشرت میں نئی قمیضوں کی طناز کریزیں
اور اس اپنی سوچ میں کوشاں رہنے پر جب تیری آنکھیں
نئے نئے چمکیلے دکھوں سے بھر جاتی ہیں ،
تجھے خبر ہے ، تب تو کتنا قریب آ جاتا ہے ، اُس دن کے
جس کی روشنیوں پر تیرے دل کے اندھیروں کا سایا ہے
اور——اس دن کے آگے کیا ہے ؟ تجھ کو بتاؤں
تو دیکھے تو آگے تجھ کو زمانے کا وہ ان دیکھا دور دکھائی دے گا
میں نے اپنی عمر میں جس کو مرتے ہوئے دیکھا تھا !

کیا تو انھی دنوں کی زنجیروں کو پھر سے پہن لینے پر آمادہ ہے
کیسے کیسے خیال مرے دل میں آتے ہیں
لرزا دینے والے دھیان ان دنوں کے ، جب لاکھوں لوگوں نے اندھیری رات کا کالا آٹا
اپنے آنسوں میں گوندھا تھا ،

کالے آٹے .....کالے پانی......

نہیں، نہیں،——میرا یہ بدن تو میرا بدن ہے جو اس مٹی ہی کے لیے تھا
لیکن.....میرا دل......میرا دل تو تیرے سینے کے لیے ہے

30 اکتوبر 1971

اے وہ جس نے اپنی صدا میں اپنی بقا کو ڈھونڈھا
اے وہ جس کی صدا کو بہا لے گئیں کڑکتی کالی آندھیاں خونی ویرانوں کی

مجھ بے دست و پا کا دل دُکھتا ہے
جانے اک وہ کیسی گھڑی تھی
اس دن ساتوں آسمانوں کی گرتی چھتوں کے نیچے
تو نے جب اپنے جی میں اپنے آخری سانس کی ٹھنڈی چاپ سنی تھی
جانے تو نے ذرا سے اُس وقفے میں کیا کیا سوچا ہوگا

اب میں کیسے تجھے بتاؤں
اب بھی ہست کا صحرا اسی طرح خود سوج ہے
اب بھی تیرے دل کا منور ذرہ تیری مٹی سے باغی ہے

کون اب تجھ سے پُوچھے
تو نے اپنے غموں کے غم میں خیالوں کے جو ابد ڈھونڈھے تھے
کیا وہ سب اس مٹی سے باہر تھے
جس مٹی کو تیرے ذہن نے اپنے وجود سے جھٹک دیا تھا

کس کے پاس جواب ہے اس کا
کون بتائے ، کس دنیا کے کن ظلموں نے لوٹ لیں
سدا چمکنے والی تیری وہ مشفق آنکھیں اور تیرا انس بھرا وہ چہرا
اور وہ ذہن کہ جس کے طوفانوں میں تو نے عمر بسر کی ، موت کے ساحل تک ،

صدیوں تک بھیگی پلکوں سے دنیا چنے گی
موت کے ساحل پر بکھرے ہوئے.....روشن ذرّے تیری صداؤں کے

21 نومبر 1971

غزل

جنگ بھی ، تیرا دھیان بھی ، ہم بھی ،
سائیرن بھی ، اذان بھی ، ہم بھی ،

سب تری ہی اماں میں شب بیدار ،
مورچے بھی ، مکان بھی ، ہم بھی ،

تیری منشاؤں کے محاذ پہ ہیں ،
چھاؤنی کے جوان بھی ، ہم بھی ،

دیکھنے والے ، یہ نظارہ بھی دیکھ ،
عزم بھی ، امتحان بھی ، ہم بھی ،

اک عجب اعتماد سینوں میں ،
فتح کا یہ نشان بھی ، ہم بھی ،

تو بھی ، اور تیری نُصرتوں کے ساتھ ،
شہر میں ڈکا خان بھی ، ہم بھی ،

12 دسمبر 2971

پھولوں میں سانس لے کے برستے بموں میں جی ،
اب اپنی زندگی کے مقدّس غموں میں جی ،

وہ سائیں ، جن کے لال لہو میں نہا گئے ،
صدیوں اب ان کے آنسوؤں اکھڑے دموں میں جی ،

جب تک نہ تیری فتح کی فجریں طلوع ہوں ،
بارود سے اَٹی ہوئی ان شبنموں میں جی ،

ان آبناؤں سے اُبھر ، ان ساحلوں پہ لڑ ،
ان جنگلوں میں جاگ اور ان دمدموں میں جی

پیڑوں سے مورچے میں جو تجھ کو سنائی دیں
آزاد ہم صیغروں کے اُن زمزموں میں جی

بندوق کو—بیانِ غم دلِ کا اذن دے ،
اک آگ بن کے پوربوں میں پچھموں میں جی

18 دسمبر 1971

"ہم تو سدا تمھاری پلکوں کے نزدیک رہے ہیں" آنسو ہم سے کہتے ہیں
"تمہیں تو تھے جن کی آنکھوں پر، بھرے بھرے پھیپھڑوں کے
ٹھنڈے ٹھنڈے دخان تھے
اور تم ہم سے ہو گئے تھے کچھ اتنے بے نسبت......
اتنے بے نسبت کہ تم اپنے لہو کو پانی نہیں سمجھتے تھے......"

آنسو سچ کہتے ہیں، ہم اب سمجھے ہیں
اب ہم روئے ہیں تو آنسو ہم پر ہنستے ہیں
بہ گئے نا ہم سب کے لہو پانی کی طرح اس اپنے دیس میں
اس اپنے گھر میں
آج ہم اپنے جیالے بیٹوں کو روتے ہیں، تو
آنسو ہم پر ہنستے ہیں
اس مٹی کے وہ بیٹے، ہم نے قیمت ہی نہ جانی جن کے چہروں کی!
اور ہم بھرے بھرے پھیپھڑوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے دخانوں کے پیچھے
یہی سمجھتے رہے کہ ہمارا لہو تو گاڑھا ہے

لیکن ہم بھی اور ہماری عظمت بھی——اب سب کچھ پانی پانی ہے
اب ہم روئے ہیں تو......آنسو ہماری آنکھوں میں ہم پر ہنستے ہیں

20 دسمبر 1971

رات آئی ہے ، اب تو تمھارے چمکتے چہروں سے بھی ڈر لگتا ہے......
اے میرے آنگن میں کھلنے والے سفید گلاب کے پھولو ،
شام سے تم بھی میرے کمرے کے گلدان میں آ جاؤ.....ورنہ راتوں کو
آسمانوں پر اڑنے والے بارودی عفریت ، اس چاندنی میں ، جب
چمک تمھارے چہروں کی دیکھیں گے ،
تو میرے ہونے پر جل جل جائیں گے اور جھپٹ جھپٹ کر ،
موت کے تپتے دہکتے گڑھوں سے بھر بھر دیں گے اس آنگن کو......

اب تو تمھارا ہونا بھی اک خدشہ ہے اور اب تو تمھارا ہونا سب کی
موت ہے ،

شاخ سے ٹوٹ کے میرے خود آگاہ خیالوں کے گلدان میں اب آ جاؤ
اور —— یوں مت سمجھو......کل پھر یہ ٹہنیاں پھوٹیں گی
کل پھر سے پھوٹیں گی یہ ٹہنیاں......،
آتی صبحوں میں پھر ہم سب مل کے کھِلیں گے
اس پھلواڑی میں......

ریڈیو پر اک قیدی......

ریڈیو پر اک قیدی مجھ سے کہتا ہے : "میں سلامت ہوں ، سنتے ہو ،
میں زندہ ہوں !"

بھائی ، تُو یہ کس سے مخاطب ہے......
ہم کب زندہ ہیں
ہم تو اپنی اس چمکیلی زندگی کے لئے تیری مقدّس زندگی کا یوں سودا کرکے،
کب کے مر بھی چکے !

ہم اس قبرستان میں ہیں......،
ہم اب اپنی ان قبروں سے باہر بھی نہیں جھانکتے
ہم کیا جانیں کس طرح ان پر ، باہر ، تیری دکھی پکاروں کے یہ ماتمی
دیے روشن ہیں
جن کے اجالوں میں اب دنیا ان لوحوں پر ہمارے ناموں کی پہچان رہی ہے

25 دسمبر 1971

سب کچھ ریت......

سب کچھ ریت ، سرکتی ریت
ریت کہ جس کی ابھی ابھی قائم اور ابھی ابھی مسمار تہیں تقدیروں کے پلٹاوے ہیں
جل تھل ، اتھل پتھل سب ، جیسے ریت کی سطحوں پر کچھ مٹی سلوٹیں،
کیسی ہے یہ بُھوری اور بھسمنت اور بُھر بُھری ریت
جس کے ذرا ذرا سے ہر ذرّے میں پہاڑوں کا دل ہے
ابھی ابھی ان ذرّوں میں اک دھڑکن تڑپی تھی ،
ابھی ابھی اک سلطنت ڈوبی ہے ،
ابھی ابھی ریتوں کی سلوٹوں کا اک کنگرا ٹوٹا ہے ،
سب کچھ ریت ، سرکتی ریت......

31 دسمبر 1971

ان سالوں میں
سیہ قتالوں میں
چلی ہیں کتنی تلواریں بنگالوں میں
اُن کے زخم اتنے گہرے ہیں روحوں کے پاتالوں میں
صدیوں تک روئیں گی قسمتیں...... جکڑی ہوئی جنجالوں میں
ظالم آنکھوں والے خداؤں کی ان چالوں میں
دکھوں ، وبالوں میں
قحطوں ، کالوں میں
کالی تہذیب کی رات آئی ہے اجالوں میں

اور اب ان زخموں کے اندمالوں میں ، اپنے اپنے خیالوں میں
چلنے لگی ہیں ، کروڑوں جبڑوں تھوتھنیوں میں ، زبانیں
جیبھیں جمی ہوئی بے مصرف قیلوں قالوں میں ،
کوئی تو میری بے زبانی کے معنی ڈھونڈھے ان حالوں کے حوالوں میں...

چیونٹیوں کے ان قافلوں کے اندر......

چیونٹیوں کے ان قافلوں کے اندر ، میں وُہ مناد ہوں ،
جس کی آنکھوں میں جب آتی آندھیوں اور طوفانوں کی اک خبر ابھرتی ہے ،
تو ان آندھیوں اور طوفانوں کی آواز کو قافلے سن نہیں سکتے ، لیکن
میرے دل کا خوف ، جو میرے دل کی عادت ہے
ان قافلوں کے حق میں اک ڈھال ہے !

تقدیروں کی یہ خبریں اور اُن کے سب دُکھ میرے لئے ہیں ، لیکن
کس نے میری خبروں کو میری آواز کے پیکر میں دیکھا ہے !
کس نے سنی ہے جاننے والی یہ آواز جو سب کے سروں پر ڈھال ہے !

سدا جئیں ان صحنوں میں یہ دھیرے دھیرے رینگنے والی ننّھی ننّھی جیتی
لکیریں
جن کے ذرا ذرا سے الجھاوے
اُن کے کڑے مسائل ہیں ،
اُن دکھوں سے بھی بڑھ کر ،
جو آسمانوں کے علموں نے مجھ کو سونپے ہیں

3 جنوری 1972

میلی میلی نگاہوں کی اس بھیڑ کے اندر اور بھی گھس کر دیکھو
قاتل جبڑوں کے جڑتے دندانوں میں شاید اک رخنہ امن کا بھی ہو

اپنے بچاؤ میں اس سے زیادہ کیسے بچے رہو گے
پہلے ہی سے اس دیوار تک ہٹے ہوئے ہو ، جس کے آگے...... آگ ہے...،
ان شعلوں کے چلتے آروں کے اندر ہی کوئی رخنہ امن کا ڈھونڈو

یہ سامن تو تمہارے دلوں کے کسی گوشے میں جدا نہیں ہے
یہ سامن تو تمہاری دنیاؤں کے کسی گوشے میں جدا نہیں ہے

اندر بھی ، باہر بھی ، ایک ہی لشکر ہے ، جس کی دو ٹکڑیاں
جنگ میں ہیں ، آپس میں ، تمہارے دلوں کی سرحد پر ، جس کے اندر کی جانب اتنی دور تک
تم کو پیچھے ہٹنا پڑا ہے ...،

اس جمگھٹ میں ، اب اک بار تو ہلہ بول کے اپنے دلوں کے اندر کا اک وہ گوشہ امن کا اپنے واسطے ڈھونڈھو
اک وہ گوشہ ، اس جمگھٹ میں اور تمہارے دلوں میں یک جا گوشہ
جس پر زندگی کے لشکر کی دو باہم متحارب ٹکڑیوں کا مشترکہ قبضہ رہا ہے اب تک......،

10 جنوری 1972

باہر اک دریا پیلی آنکھوں کا لہراتا ہے
آنکھیں جن میں پتّوں کا پانی رس رس آتا ہے
ہم کو دیکھ کے !

اب ایسے میں، کس کس بوجھ کو سر سے جھٹکیں
دل میں نیکیاں دہل دہل جائیں اور اپنے گن ڈھارس نہ بنیں !

ہر جانب سے ذہنوں میں اُمڈی ہوئی کالی حرصیں
اپنے برچھے تان کے دھیرے دھیرے گھات میں سرکیں
ہم کو دیکھ کے !

اب ایسے میں کون بتائے کن جتنوں سے ہم نے اپنی دبلی پسلیوں کے نیچے
ان اپنے دلوں میں سنبھال کے رکھی ہیں
یہ اتنی اذیت دینے والی سب تسکینیں

جن کے باعث،
ہم پتّوں کے پانیوں سے بھری ہوئی ان صدہا آنکھوں کے سامنے ڈرتے بھی ہیں
اور اس ڈر میں جینے کا دکھ خوشی سے سہتے بھی ہیں

13 جنوری 1972

لمبی دھوپ کے ڈھلنے پر اب......

لمبی دھوپ کے ڈھلنے پر اب ، مدتوں کے بعد ، ایک یہ دن آیا ہے
دن— جو ایسے دنوں کی یاد دلاتا ہے جو سدا ہمارے ساتھ ہیں
اس کہرے میں— اس جاڑے میں
اُمڈے ہوئے ان ریزہ ریزہ بادلوں میں— وہ سب نزدیکیاں ہیں ،— جو
میرے وجود کا طلسم رہی ہیں
ورنہ ، کتنے دور ہیں دکھ جو صدیوں کا حصہ ہیں
کتنی دور ہے موت ، جو ان سب بستیوں پر چھائی ہے ، ان سب بستیوں
کا حصہ ہے !

اس لمحے تو دکھ اور موت کی ان نزدیکیوں میں بھی زیادہ قریب ہے
وہ غافل کر دینے والی بے حس زندگی
اور وہ زندہ رکھنے والی جابر غفلت
جو اس میرے وجود کا طلسم رہی ہے ،

اس ٹھنڈک میں یہ اک دھیمی سی مانوس تمازت
ساری بھولیں ، سارے خیال ،— اسی کی کونپلیں
میرے گھر میں آم کے پیڑ کے نیچے تو خندق ہے
اب کے کھاد اس کو کیسے ڈالیں گے
کب آئیں گے آنے والے دن ، اور بور اور کونپلیں
کبھی نہ آنے والی رتوں کے دھیان کہ جن پر آج تو نظریں
جم جاتی ہیں
اور میں سوچتا بھی نہیں کیا کوئی کل بھی آئے گا
ساری ندامتیں بھول گیا ہوں

اور وہ سب نزدیکیاں ، جن کو میں نے اب تک اتنی دوری سے دیکھا ہے
آج تو وہ سب میرے سامنے ہیں ، اس جاڑے میں ، مدت کے بعد آنے
والے اس کہرے میں

23 جنوری 1972

اندر، روحوں میں جو اک روشن روشن قوت ہے وہ تو ہماری ہے اور بے تسخیر ہے

یوں بھی سمجھ لیں... ،
پھر بھی لاکھ بچائیں اپنے دلوں کو—دھبہ تو پڑ ہی جاتا ہے
یہ نورانی قوت تو مٹی کے رابطوں سے ہے
چھتیں رکوعوں کی ، ڈھالیں سجدوں کی ، اور دعاؤں کے سب قلعے .
کوئی تمہارے حلق پہ جب مٹی کا انگوٹھا رکھ کر کچھ کہتا ہے ،
تو سب قلعے گر پڑتے ہیں

چڑیا اپنی پیاس بجھانے سمندر کے ساحل پر آتی ہے تو اپنی ننھی چونچ میں کتنا پانی پی لیتی ہے !

نیکی بھی تو سمندر ہے جو سب روحوں پہ روشن روشن اور مواج ہے !
ہم کتنا پانی پی لیں گے اس سے ،
لاکھ بچائیں دھبہ تو پڑ ہی جاتا ہے دل پر

اُن پہ سلام ، کہ جن کے قدموں کی مٹی سے دونوں جہانوں کی تقدیسیں ہیں

25 جنوری 1972

اس دنیا نے اب تک ہم کو ہمارے جس بھی دکھاوے سے پہچانا
ہم نے اُس کی پرستش کی ہے ، ہم نے اُس کی حفاظت کی ہے
اور اب اُس کی حفاظت کرتے کرتے اُس کی حقیقت کو بھی کھو بیٹھے ہیں ،

اور نہ اب وہ جھوٹ رہا ، اور نہ اب وہ سچ ہی ،

اب تو دنیا سے چھپ چھپ کر اُن دیسوں میں ہم پھرتے ہیں
جن میں کوئی ہمیں پہچاننے والا نہیں ہے
اب تو نہ اپنے سامنے آ سکتے ہیں ،—اپنا دکھاوا ہی ہم پر ہنستا ہے—
اُور نہ غیروں کے آگے اپنے اصلی روپ کو لا سکتے ہیں ،—
—خیر سے ، بغیر اس اپنے دکھاوے کے ہم ہیں کیا !—

اب اَن جانے دیسوں میں پھرتے پھرتے اپنے دکھ یاد آئے ہیں ،
اب ان دکھوں میں جینا ،
اب اس نا محرم اور سونس دھوپ میں پھرنا ،
اپنے خلاف عمل کرنا ہے ، اپنے دکھاوے کو خود جھٹلانا ہے
اور غیروں کے حق میں وہ کچھ سوچنا ہے جو ان کے دکھاوے ان کے
حق میں سوچ نہیں سکتے

اب اس راس میں ساری پتلیاں ہم پر ہنستی ہیں ،—سارے جھوٹ ہمارے
جھوٹ پہ ہنستے ہیں...

6 فروری 1972

دکھیاری ماؤں نے اپنے دبلے آنسوؤں میں پالا اپنے جن بیٹوں کو
ان بیٹوں کی عفتوں پر تو سورج بھی پلکیں بچھا دیتے ہیں !

جب بھی لہو میں مقدّس مٹی کی یہ طینت گھلتی ہے ، تو کیسی کیسی
سلسبیلایں ہیں جو ان نینوں میں اُمڈ آتی ہیں

لیکن کون ان سادہ سادہ دنیاؤں کی سنے گا
جو ان پلکوں کے سایوں میں حدِ افق تک بالیدہ ہیں ،

لیکن—ان کی کون سنے گا
آگے تو ہر جانب ایسی آنکھیں ہیں ، جن کے پردوں کے پیچھے
ایسے ایسے خدا اب گھورتے ہیں—سب مجھ جیسے خدا اور سب تجھ جیسے
خدا— ، جو
کالی لمبی جریبوں سے اپنے جثوں اور اپنی کبریائی کو ناپ کر
آنے والی تقدیروں کا زائچہ کھینچنے کے عادی ہیں

ہم جن کی آنکھوں پہ ہمارے ضمیروں کے خمیازوں کا پردہ ہے
کب اُن سلسبیلوں کو دیکھیں گے ، کب دیکھیں گے اُن سلسبیلوں کو
جن پر آسمانوں کے دل بھی پسیجے ہوئے ہیں

15 فروری 1972

کبھی کبھی تو خود اندوزی کی کیفیت میں، جب
میرا کاسۂ سر، ٹھوڑی تک، اس میرے سینے میں دھنس جاتا ہے
اور جب میری گردن ہل بھی نہیں سکتی، اور ایسے میں، جب
اس دنیا کی بابت میرا جھوٹا سچا علم مری آنکھوں سے اس دنیا کی جانب
جھانکتا ہے،...تو

مجھ میں اک فوقیت کا احساس ابھرتا ہے، اور
کس نفرت سے ان سب لوگوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا ہوں، جو
میرے جھوٹے سچے علم اور میری جھوٹی سچی فوقیت کا ماخذ ہیں
اوروں کے بھید، اور ان بھیدوں کے عیبوں سے آگاہی، کیسی فوقیت ہے،
جس میں

میرا دل اک کبریائی سے بھر جاتا ہے،
اور میں اپنے آپ سے غافل ہو جاتا ہوں
اس اک آگاہی میں کیسی کیسی غفلتیں اور بے علمیاں ہیں یہ کس کو
خبر ہے
لیکن وہ جو اک کیفیت ہے، جب کاسۂ سر اس طرح سے، ٹھوڑی تک
سینے کے خول میں دھنس جاتا ہے

اور جب گردن ہل بھی نہیں سکتی اور آنکھیں ٹکٹکی باندھ کے
اپنے شکر کی جانب گھورتی ہیں، اک وہ کیفیت تو بندے کے خدا ہونے
کی گھڑی ہوتی ہے
ساری گراوٹیں اس جھوٹی فوقیت سے اگتی ہیں
پھر بھی دنیا تو صرف ان لوگوں سے ڈرتی ہے نا، جن کی گراوٹیں دوسروں
کے عیبوں کو جانتی ہیں
کون مجھے پہچانے گا کہنے کو تو سب کے دلوں کے دروں خانے میں
میرا صدق گزر رکھتا ہے

27 فروری 1972

ڈھلتے اندھیروں میں، کچی مٹی پر، کولتار کی سڑکوں پر، ہر جانب
وہی پرانی —— کھدی ہوئی سی —— لکیریں پہیوں کی اور وہی پرانی
گرد —— عناد —— اور جمگھٹ
وہی پرانی روندی ہوئی سی صحبتیں ——
لیکن کہاں سے آئی ہیں یہ دل کے مساموں میں بھر جانے والی مہکاریں اَن دیکھے پھولوں کی
کانوں کے پردے بجتے نظر آتے ہیں —— تھمے ہوئے سب شور اور دل کے پردے بجتے نظر آتے ہیں، ——
ازلیں بھی ایسی ہی خوشبوؤں میں جاگی ہوں گی!

شام کی سڑکیں، وہی پرانے چہرے
سارے دن کی تھکی ہوئی یہ عبودیت، اور بے مہر نگاہوں کے آوازے ہر سو،
سب لوگ اپنے دلوں کی دھرتی پر بے سامن، سب ان راہوں پر بے منزل،
یونہی، جانے کب سے......

اور بستی کی دیواروں کے ساتھ ساتھ اب کتنے سکون سے نہر میں پانی
دھیرے دھیرے چمکتا چمکتا رواں ہے...... اب، جب رات کا سارا کالا بوجھ ان گھنے گھنے پیڑوں پر آن جھکا ہے
دیواروں کے گھیرے میں اب یہ کیسی نیندیں سلگ اٹھی ہیں جن کے عبیری دھوئیں میں موت اور زیست کی سرحدیں مل جاتی ہیں!

ایک زمانہ ختم ہوا ہے —— اک دن گزرا ہے!

13 مارچ 1972

سدا زمانوں کے اندر——
ذہنوں میں بھی اور زبانوں پر بھی ، تیرے ہیں ، بے جسم وجودوں والے،
جو جو نام
ان کے ابد کیسے ہیں ، اور کیا ہیں
سب کچھ بس اتنا کہ ہم ، اب بھی اُن ناموں کو دہرا کر اپنے جی کو
گدلا کر لیتے ہیں
ورنہ یوں تو جانے کب سے طاقِ جہاں پہ ابد کے مرتبانوں میں ان کے
مرتبے پڑے پڑے سب گلتے ہیں
کبھی کبھی ان مرتبانوں سے ذرا ذرا سا دکھ چکھ کر ہم اپنی روح
کا ذائقہ بدل لیتے ہیں اور اپنے جی کو گدلا کر لیتے ہیں
لیکن اس سے اُن جسموں کو اب کیا لابھ ہے جو خود تو اب مٹی ہیں اور
جن کے نام ہمارے ذہنوں میں بھی اور زبانوں پر بھی جاری ہیں

ان سے تو اچھا ہے ، گتھم گتھا بازاروں میں ، اس بھرپور طمانیت سے
شاپنگ کرنے والا یہ اک شخص
کوئی ابد بھی جس کی قیمتی مٹی کا زنگار نہیں ہے !

ایسے اب کون اُن کو پہچانے ، کون اب ان کے ابد کی حقیقت کو جانے
اک اک کر کے کاٹ گئے ظلموں کے ٹوکے جن کی عمروں کو ، اک اک
کر کے .

16 مارچ 1972

اور ، وہ لوگ اپنے ناموں کے حرفوں میں اب بھی زندہ ہیں جب وہ نام
ہماری زبانوں پر آتے ہیں
ہم ـــ جو اپنی بقا میں موت کا سلسلہ ہیں

ہم سے اچھے ہیں وہ لوگ
پھول ہمارے باغوں میں
جن کی قبروں کے لئے کھِلتے ہیں ۔

ہم جو گردش کرنے والے کُروں کے پاتالوں کی مٹی میں بے تذکرہ
ذرّے ہیں
ہم بھی تو ہیں وہ جیتی مرتی روحیں ، جن کے ہونے اور نہ ہونے کا یہ
دائرہ ، اُن ناموں کی بقا کا دائرہ ہے ،
جن ناموں کے ذکر کی خاطر ہم بے تذکرہ ہیں !

سب کچھ دیکھ کے ،
سب کچھ جانچ کے
اب بھی لمبی بے انت آنتیں یوں دن رات اس موجِ غرور کو کشید کرنے
میں لگی ہیں جن سے ہماری آنکھیں بھری ہوئی ہیں ، اور
اب بھی ہم اُن ناموں سے بے نسبت ہیں جن کی بقا کی خاطر ہم بے تذکرہ
ہیں

23 مارچ 1972

پختہ وصفوں کے بل پر، بے حد قربانیوں کے بعد، اک ایسی منزل آتی ہے
جہاں پہنچ کر اُس مقصد کی طمانیت ملتی ہے
جس کی بلندی ایک گراوٹ کی جانب بڑھتی ہے!

اور اس لمبے سفر میں اک یہ گراوٹ بھی کیسی منزل ہے
جہاں پہنچ کر، انساں اپنے وصفوں سے واصف نہیں رہتا
لیکن دنیا والے اس کے اُن پہلے وصفوں ہی کی بنا پر اس کی گراوٹ سے
بے دل نہیں ہوتے!
اک یہ کیسی منزل ہے: جس تک جب کوئی پہنچتا ہے، تو اس کے
سوجے ہوئے پپوٹوں کے نیچے،
اس کی آنکھوں میں، پتلیاں کم حرکت کرتی ہیں
اُس کی نظریں اپنی کامیابی پر رکی جمی رہتی ہیں
اور وہ بے نسبت ہو جاتا ہے، اس دنیا سے بھی
جس کو اُس کے سفر کی کہانی یاد ہے!

کیسا یہ گُھن ہے، جو سینہ تان کے چلنے والی تقدیسوں کے پنجر میں جوہر
چاٹ جاتا ہے!
اور ہر جانب اونچے مقصدوں کے سنگین لبادے اوڑھ کے کھوکھلی روحیں
اکڑ اکڑ کر چلتی نظر آتی ہیں
کون انھیں پہچانے،
سونے کی تہ پانی میں ہے —— اور مٹی کا چہرا باہر ان سطحوں پر!

26 مارچ 1972

ساتوں آسمانوں کے عکس اور کنکر آ آ کر گرتے ہیں خیالوں کے خانوں میں......
یہ سب کچھ ان الگ الگ خانوں میں ، اک وہ یکجا مخفی قوت ہے ، جو
مجھ پر ظاہر تو نہیں لیکن جو یوں ہونے میں میری ہونی کے ساتھ ہے

میرے شعور کو ان کا علم نہیں ہوتا ، میں پل پل ، جن جن وارداتوں میں
بہ جاتا ہوں
اور اپنے ہونے کی جس جس ہونی میں ہوتا ہوں......
اور جب کوئی مجھے یوں سنبھالتا ہے جیسے وہ میرے ساتھ ہے !

اک یہ خود آگاہ سی بے خبری جو میرے شعور کا جوہر بھی ہے
اور جو میرے شعور کے علم سے باہر بھی ہے
زندگی میں اک زندگی ، آسمانوں سے آنے والی ،——مٹی جس کی روح ہے !

4 مئی 1972

اپنے آپ کو بھولے ہوئے ہونے میں ، جب اس اپنی بھول کو بھی تم بھولے
رہو گے ،
تو ان پتھریلے فرشوں پر چلتے چلتے اچانک کبھی کبھی تم یوں محسوس
کرو گے
جیسے گہری شاموں کی ، ہلکی سانسوں میں
جی اٹھا ہے ، وہ سب کچھ جو غربِ غروب میں ، اتنے فاصلوں پر ہے
زمانوں سے بھی باہر ،
اور تم لوٹ آئے ہو ، خود اپنی یادوں میں ۔ اُس کے ہمراہ
اپنے آپ کو بھولے ہوئے ہونے میں بھی !

25 مئی 1972

دلوں کی ان فولادی بیٹھکوں میں ، کس تک ان مفہوموں کے سب معنی
پہنچے ہیں

مفہوم ، ان حرفوں کے ،
حرف ، کہ جن کی عبارت کھردرے کاغذ کے میلوں لمبے مسطر پر ،
روزانہ ، لاکھوں بھوکی آنکھوں کا ناشتہ ہے ،

کس کے فہم نے معنی جذب کیے ان سب حرفوں کے ،
جس کی کالی روشنائی سے لہو رستا ہے ،
کس نے ان حرفوں سے رِستے لہو کو دیکھا ،
لہو ،...... لہو ہم سب کا ، دھانی دیسوں ، گدلی آ بناؤں میں ،
کس نے جانا
ان صبحوں میں ، ان میزوں پر ،
ورق الٹتے ہی روز اک عہد گزرتا ہے ، ان مارملیڈ لگے توسوں کے درمیان

ورق الٹ کر ، لو وہ زوں زوں کرتے ، گھوم گئے پھر سب دل
اپنے اپنے محور پر ، اپنے اپنے اطمینانوں میں

اپنا دل تو دیکھے دنوں سے دکھنے لگا ہے

27 مئی 1972

زندگیوں کے نازک نازک......

زندگیوں کے نازک نازک دُکھی دُکھی موڑوں پر جو جو لمحے آتے ہیں
اک دن ، اپنے سارے آنسووں سمیت ، بھنچے ہونٹوں کے پیچھے ، دلوں کی تاریکی میں
——مر جاتے ہیں ،
ان کو کیوں مرنا تھا
یہ جذبے تو اس اک سچائی سے پھوٹتے ہیں جو روحوں کا جوہر ہے ،
لیکن یہ دل کیوں ان جذبوں کا مدفن ہے ،
پاؤں تو پھر بھی ڈگ مگ ڈولتے ہیں ان گلیوں کی رسموں میں......

مرنے والے ساتھی کے ماتھے کو چومنے والے تھر تھر کانپتے ہونٹ ، یہ سب کچھ بھول کے ،
پھر بھی ان صحنوں کی ریتوں میں ہنستے بولتے جی جاتے ہیں ،

مُند جانے والی آنکھیں مٹی میں سو گئیں ، جینے والے اقراروں کے سامنے بندے ، تو اُن آنکھوں میں اُن سب اقراروں کا شاہد ہے
نہیں ، نہیں ، تو اُن اقراروں کی جاگیر ہے ،

یہ کس سانسوں کے پنجر نے تیرے دل کے مدفن میں کروٹ بدلی ہے
تو کیا سمجھا ، بندے ،

شاید ، سارے سچ تو اس سچائی میں ہیں ، جس کا کسی کے ساتھ اقرار نہیں ہے -

27 مئی 1972

تیری نیندیں جانتی ہیں ، ری سنّو
تیری لمبی بے کھٹکا نیندیں جانتی ہیں کیا
تجھ کو تھپکنے والے ٹھنڈے ہاتھوں کے پیچھے یہ کس کا دل ہے !
اور یہ جو نیندیں لانے والی کم سِن صبحیں آئی ہیں
کتنے اندھیروں کے ساتھ اب اس اک دل میں ابھری ہیں
اک دل ، تجھ کو تھپکنے والے ہاتھوں کا بازو

گندمی محنت زاروں ، دھانی کا جواڑوں ، اور بے رزق دروں میں
لاکھوں ہاتھ ، پنگھوڑے جھلانے والے ، اور ان کے پیچھے ، اک یہ دل
اک دل ، ان ہاتھوں کا بازو ،

تجھ کو خبر ہے ، ری سنّو تیری نیندوں کو دیکھ کر
آج تو یہ اک دل ، کن دنیاؤں میں جاگا ہے جو اُس کی آخری دھڑکن سے
بھی ورے ہیں
کالے سماج ، بلکتے بچپن اور اپاہج عمریں

آج بھی اپنی دھڑکنوں میں یہ اک دل تیرے لیے کیا کر سکتا ہے
کل بھی وقت کا پیکر کیا کر سکے گا یہ دل جس کا ٹوٹا ہوا بازو ہے ،

کاش ، یہ اک دل، تیرے جاگنے میں اک شاداں بھناپے کی مسکانوں میں جاگے،

10 جون 1972

ان بے داغ ، دبیز غلافوں کے......

ان بے داغ دبیز غلافوں کے عطروں میں یوں تو سب کچھ ہے ،
——جن کو تمہاری آنکھیں چومتی ہیں
ان شفّاف چمکتی دہلیزوں میں یوں تو سب کچھ ہے
——جن پہ تمہارے سجدے بچھتے ہیں
پُرہیبت دیوارں میناروں اور گنبدوں کے سایوں میں یوں تو سب کچھ ہے
——جن میں داخل ہوتے ہی تمہاری سانسیں
ابد کے بوجھ کے نیچے رک رک جاتی ہیں

تقدیسوں کے اسیرو ، تُم یہ بھی تو سوچتے

اصل میں سب کچھ تو وہ برتاوے تھے جن کو عمروں کے اس ٹکڑے
نے اپنایا ، جو اب ان قبروں کی مقّدس مٹی ہے
تم بھی اس اک پل کو جگمگا سکتے ہو ،
جس کا تمہاری عمر اک ٹکڑا ہو ،
ورنہ یونہی ان اپنی سچّی سوچوں میں ٹھوکر کھاؤ گے ،.....

9 جولائی 1972

جس بھی روح کا گھونگھٹ سرکاؤ، نیچے اک منفعت کا رخ
اپنے اطمینانوں میں روشن ہے،

ہم سمجھتے تھے، گھرتے امڈتے بادلوں کے نیچے جب ٹھنڈی ہوا چلے گی
دن بدلیں گے،
لیکن—اب دیکھا ہے
گھنے گھنے سایوں کے نیچے
زندگیوں کی سلسبیلوں میں
ڈھکی ڈھکی جن نالیوں سے پانی آ آ کر گرتا ہے، سب زیرِ زمیں نظاموں
کی نیلی کڑیاں ہیں
سب تمایکیں ہیں، سب تذلیلیں ہیں،
کون سہارا دے گا اُن کو، جن کے لیے سب کچھ اک کرب ہے
کون سہارا دے گا ان کو، جن کا سہارا
آسمانوں کے خلاؤں میں بکھرا ہوا دھندلا سا اک عکس ہے،

میں...ان عکسوں کا...عکّس ہوں

11 جولائی 1972

باڑیوں میں مینہ کا پانی ، اور ان کے ساتھ ساتھ آگے تک ،
کیچڑ کیچڑ ڈھلوانوں کی نم مٹی پہ چمکتی ٹھیکریاں
اور تنکے
جن میں کُھبے کُھبے سے نقش ، ان قدموں کے ، جو
ادھر سے جیسے ابھی گزرے تھے زمانوں کے اوجھل

اب کوسوں ، خطّوں دور ، اینٹوں کے گھیرے میں یوں بیٹھ کر سوچنا ،
ان روحوں کے بارے میں ، جو
گونگی ، منہمک چیونٹیاں تھیں ، اپنے جتنوں میں
اپنی اپنی نارسائی میں......
اب اس ٹھنڈی سانس کے قلعے میں یوں بیٹھ کر سوچنا
کتنی بڑی ہزیمت ہے ، ان آہنی خوشیوں کی ، جن
کی نوکیلی باڑ سے
باہر ہیں ان روحوں کے وہ سب دکھ اور وہ سب
نیکیاں
جو زینہ تھیں ، اس قلعے تک

آج اس ٹھنڈی سانس کے قلعے میں یہ آہنی خوشیاں سب کتنی بے امن ہیں

سارے امن تو نازک اندیشوں والی زندگیوں ہی میں تھے ، جن کے
نقشِ قدم کیچڑ کیچڑ ، ڈھلوانوں سے جیتی گلیوں
تک جاتے تھے !

19 جولائی 1972

اب بھی آنکھیں اُن کو ڈھونڈتی ہیں جو اب بھی آنکھوں میں بستے ہیں
ہر جانب بستے ہیں وہ—ہم جن کا بھرم تھے جب وہ تھے
اب بھی ہمارے ساتھ ہیں اُن کے دکھ، ہم جن کا مداوا تھے جب وہ تھے

اب تو اُن کے رابطے
ہماری زندگیوں کے غیاب میں
جینے والے کشف ہیں

کون بتائے اپنے رازوں میں ہیں کتنی بیکراں—یہ بے فاصلہ دوریاں
جانے کن اقلیموں سے آتے ہیں خیالوں کے ہلکے ہلکے سے جھکولے
جو—چپکے سے—دھیرے دھیرے—روحوں کے کنجوں میں سر سراتے ہیں
تو آنکھوں میں بھر بھر جاتی ہے مٹی اُن آستانوں کی—
جن کے اسٹ نشانوں کے سامنے
اُن کے دعا کے ہاتھ ہمارے لیے اٹھے تھے

ان کی سانسوں میں جینے والے زمانے ہمارے دلوں میں جاگتے ہیں...اور
اب بھی
ہماری آنکھوں میں بستے ہیں وہ ہم جن کے ضمیروں میں تھے، جب وہ تھے!

1 اگست 1972

اس کو علم ہے ...

اس کو علم ہے ، اب وہ ایک سیاہ گڑھے کے دہانے پر ہے
آگے...اک وہ گڑھا ہے اور اُس کا وہ اگلا قدم ہے ،
اب بھی، اس کی بے بِ حِس ، بے بِ دانت ، اوچھی ، مسترخی باچھیں ہنستی ہیں
اس کا دل نہیں ہنستا ، اور اس کی باچھیں ہیں جو ہنستی ہیں
یہ اک پُر تحقیر تلطّف ، دھار ہے اُس تلوار کی جس کی زد اتنی کاری ہے
سب اس وار سے اپنی ذلّت کی عظمت پاتے ہیں

اُس خوش بخت کو علم ہے اُس کے دن تھوڑے ہیں
اس کو علم ہے اس کا آخری وار اور اس کا اگلا قدم اک ساتھ پڑے ہیں
آگے اک وہ گڑھا ہے اور اس کا وہ اگلا قدم ہے
اب ایسے میں ، جتنے سانس بھی ہیں اس گڑھے سے باہر
جس سے کبھی کوئی باہر نہیں نکلا ،
اُس کی کوشش ہے ، وہ اُس اک وقفے کے اندر ، بھر لے اپنی باچھوں میں
کچھ گھونٹ اور بھی ،
خوشیوں کے اس گاڑھے جوشاندے کے
جس میں مظلوموں کا لہو پکتا ہے !

1 اگست 1972

بھُولے ہوئے وہ لبھاوے تب تو کتنے سچّے کتنے کھرے تھے ،
تب تو اپنے وقت کی سچائی تھیں گندھی ہوئی وہ جھوٹی خوشیاں
جو اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کے اک دن سیدھی اس میرے دل میں
آئی تھیں
اب تو سچ سچ وہ خوشیاں جھوٹی لگتی ہیں ، اب کہتا ہوں کتنا بھولنہار
تھا تب میں..... ،
اب تو اور ہی جھوٹی سی اک اپنی سوجھ کی سچائی پر اِتراتا ہوں ،
جانے اس کروٹ کو آگے چل کر میں اک بھول ہی سمجھوں

شاید سب یہ گزرنے والے دن ہوں دکھاوے اُن سب آنے والے دنوں کے
دن جو میرے دل تک میرے جھوٹ کی سیڑھیاں ہیں ، دن اب جن کے
لوبھ میں جینا ہوگا
میری موت کی سچائی تک !

4 ستمبر 1970
10 اگست 1972

اور ان خار زاروں میں چلتے چلتے خیال آتا ہے :
'سدا ہمارے دلوں میں چٹکنے والی کلیوں کی یہ بہاریں
جن صبحوں اور جن شاموں کا موسم ہیں
وہ دن آئیں گے تو...... '

اور کانٹوں کی ٹوٹتی نوکیں ہمارے قدموں کے نیچے کڑکڑانے لگتی ہیں
اور سانسوں کی لہر میں لوہے کی سیّال سی پتری جڑُ جاتی ہے
اور زمین کی پیٹھ پر اپنا بوجھ بہت کم رہ جاتا ہے

اب تک ہم نے کیسے کیسے یقینوں کے ان نیام جڑے پیالوں میں
عمروں کا زہر پیا ہے،

یوں کتنے ڈربوں میں اس کے چہروں پر اک مٹیالی سی
دمک جیتی ہے،
آسمانوں کی گونجتی پہنائی میں ہمارے نام کے ذرّے
بکھر بکھر جاتے ہیں

اور یہ سب کچھ، کبھی نہ مرجھانے والے پھولوں کے ڈھیر ہمارے
من میں
اور یہ سب کچھ، ایسے وقت میں جب اپنے دامن میں پیتل کی اک
پنکھڑی بھی نہیں ہوتی

10 اگست 1972

تُو تو سب کچھ جانتا ہے......

تُو تو سب کچھ جانتا ہے ، وہ کیسی کیسی شکستہ کمر توقیریں تھیں ،
میں جن کی خاطر
تجھ سے طاغی ہو کر ، ڈوبا رہا ہوں
اس اک گہری ٹھنڈی سانس میں
جس کے چلتے آرے کی یہ دھار ، اب
میرے دل کو چیرنے لگی ہے

سب کچھ والے ، سب کچھ تو تجھ سے تھا
اپنی روح کے اس خاکی سے دکھاوے کی خاطر ، اک میں ہی
جھوٹے خیالوں کی یہ کچّی تیلیاں جوڑ کے ،
اپنے گمانوں کے قلعے میں یوں اب تک در بند تھا

ورنہ ساری صولتیں تو اس نام کو حاصل تھیں جو تیرے ظاہر و مخفی
وجود سے باہر ،
تیرا اسم ہے

سچّی عزّتوں والے ، ان سب کائناتوں میں جو کچھ عیاں ہے ، اس سے بھی
بڑھ کر اظہر ہیں
تیری عطائیں ، جن کے ستر میں ہیں ناموس
ان سب ناموں کے ، جو سورج کے نیچے جلتے ہیں
یا جو مٹی کے اندر جیتے ہیں !

مرے نجس نکمے ناری نام کو اپنے کرم کی رمزوں کے زمروں میں رکھنا

11 اگست 1972

مجھ کو ڈر نہیں اس کا ، آج اگر میں ڈرتا ہوں ، اس قہقہے سے ، جو میری
اس آواز سے ٹکرایا ہے—
—یہ میری آواز جو اک اور شخص کے دل سے صدا اُبھری ہے !—

آج اس خوف کا دن ابھرا ہے ، اور کل بھی شاید یہ قہقہہ حاوی ہوگا
اس آواز پہ جو میری آواز ہے
اور جو اک اور شخص کے دل سے صدا اُبھری ہے

اور اُس شخص کا دل تو گونجتا زمانہ ہے اور میرے دل میں کبھی نہیں
بیتا وہ دن ، جب
ان راہوں پر ،
اس کے تنہا ہات میں مشعل کی لو اور اس کے تنہا قدموں میں زمانوں کی
آہٹ اک ساتھ بڑھی تھی ، میری جانب !

آج اک قہقہے کی کالی قاتل برچھی جو میرے دل کو کاٹ گئی ہے
اس آواز کے سینے میں پیوست ہے ،
آج اس قہقہے سے ڈرتا ہوں ، لیکن آج کے اپنے ڈر سے میں نہیں ڈرتا
اک دن آئے گا جب وقت اپنی آواز میں جاگے گا ، سب کالے قہقہوں
پر حاوی

18 اگست 1972

غزل

اک سانس کی مدھم لَو تو ہی ، اک پل تو ہی ، اک چھِن تو ہی
تج دو کہ برت لو دل تو ہی ، چُن لو کہ گنوا دو دن تو ہی

لرزاں ہے لہو کی خلیجوں میں ، پیچاں ہے بدن کی نسیجوں میں
اک بجُھتے ہوئے شعلے کا سفر ، کچھ دن ہے اگر کچھ دن تو ہی

میں ذہن پہ اپنے گہری شکن ، میں صدق میں اپنے بھٹکا ہوا
اِن بندھنوں میں اک انگڑائی ،—منزل ہے جو کوئی کٹھن تو ہی

اس ڈھب سے جیئں ، سینوں کے شرر ، جھونکوں میں گُھلیں قدروں میں تُلیں
کاوش ہے کوئی مشکل تو ہی ، کوشش ہے کوئی ممکن تو ہی

پھر برف گری ، اک گزری ہوئی پت جھڑ کی بہاریں یاد آئیں
اس رُت کی نچنت ہواؤں میں ہیں ، کچھ ٹیسیں اتنی دُکھن تو ہی

8 ستمبر 1972

عرشوں تک اونچے آدرشوں کے فیضانوں میں بھی،
اس طرح سے ہمیشہ ڈرتے رہے ہیں لوگ ، اُن لوگوں سے ، جو
اپنے بازوؤں میں سب تدبیریں رکھتے ہیں
اور یہ کون بتائے اِس اک ڈر کے ناطے کتنے کچّے ہیں ، کتنے سچّے ہیں

تدبیروں والوں کی گردنیں ہل نہیں سکتیں ،
لیکن ڈرے ہوئے لوگوں کی اک اک التجا کو اپنی پلکوں سے چُن لیتی ہیں وہ آنکھیں...جو
ان سب موٹی موٹی گردنوں ، خود سر کھوپڑیوں سے جھانکتی ، فاتح فاتح ، لرزاں لرزاں
اور یوں طاغی روحوں کو عظمت کی غذا ملتی ہے
اور یوں ناتواں چیونٹیاں قدموں کے نیچے پِسنے سے بچ جاتی ہیں

اور میں نے یہ دیکھا ہے ، روز ان خشت کدوں کے اندر ، اک اک ہمہمانے چھتّے میں
جس میٹھے مٹیالے شہد کی بانٹ ہے
اُس کو نارسا عاجزیاں ان پھولوں سے حاصل کرتی ہے ، جو فرعونوں کے باغوں میں کِھلتے ہیں

زینہ بہ زینہ اک اک بام پہ بت اور اُن کی لکھ لُٹ آنکھیں ، ہنستی ارذل خوشیاں بانٹتی
روز و شب کی احتیاجوں میں ، یوں ہی فرشوں کے دھندے چلتے ہیں ،
عرشوں تک اونچے آدرشوں کے سایوں میں

12 ستمبر 1972

آخر تمہیں بھی سوجھی یوں ہم ڈرے ہوؤں سے ڈرنے کی ،
نا بھئی ، اب ہم پھر نہ کہیں گے ، بات یہ جینے مرنے کی ،
ابھی سنی جو تم نے کتھا یہ ، موت کے مشکل لمحے کی......
وہ تو جیتے جی ، خود جی سے گزرتی سوچ کی کروٹ تھی -
کاہے کو تم گھبرا گئے - یہ تو روپ تھا خود سے لگاوٹ کا ،
یونہی ذرا کچھ اپنے آپ سے روٹھ کے ہم نے دیکھا تھا ،

اچھا مان لیا ،—ہیں زخم ان بھیدوں کے سب دُکھن بڑے
ہونے اور نہ ہونے کے اس اُلجھیڑے میں کون پڑے ،
چھوڑیں بھی وہ جھوٹی سچّی بات—ذرا اب دنیا کو
ایک نظر ہم اپنی شکم سیر آنکھوں سے بھی دیکھیں تو ،
تمہیں خبر ہے ، تم سچّے ہو ، دنیا کی یہ انوکھی دھج
صرف اک سورج سے ہے وہ بھی تمہارے چہرے کا سورج

تم سچّے ہو ، جو کچھ بھی ہے جیتے دنوں کا میلہ ہے ،
مٹّی جسم ہے ، مٹّی نور ہے ، مٹّی وقت کا ریلا ہے
ہرے بھرے میدان ، ابلتے قریے ، باسمتی کی باس
سانسیں ، عمریں ، قدریں ،—سب کچھ سکّے ، پیّے ، چربی ، ماس
سب تقدیریں ، سب ہنگامے ، سب یہ مسائل بھنور بھنور
سب کچھ ایک خنک سا جھونکا ، تمہارے رُخ کے پسینے پر !

اچھا ، اب تو خوش ہو ، اب بھی سنو تو میرا دل یہ کہے :
بھائی ، کل کیا ہوگا...کل جب ' بیگھے خون میں بھیگ گئے !

1966

14 ستمبر 1972

دل تو دھڑکتے آگے بڑھتے قدموں کا اک سلسلہ ہے
دل کا قدم جو گزرتے وقت کی منزل طے کرتا ہے
ساتھ ہی ، ایک ہی وقت میں ، بیتے وقتوں کی جانب بھی بڑھتا ہے
دل پر وقت کی جو منزل ہے ، طے نہیں ہوتی......
بس اک انجانی سی آگہی ہے ، جس کی بیدار مسافت پر سب مرحلے ،
اک ساتھ ، اپنی گزرانوں کی نیندوں میں ، جاگتے ہیں

بیٹھے بیٹھے آج اُس کیفیت سے ڈر اُٹھا ہوں ، جس کو پہچانتا ہوں ، اور جس کی بابت
جانتا ہوں ، یہ کیفیت اُس وقت ابھرے گی
آنے والے دن جب گزرے دنوں کی منزل سے گزریں گے

گزرے ہوئے زمانوں کی منزل سے گزرنے والے ، آنے والے دنوں کا خیال آتے ہی
وقتوں کی کچھ سطحیں دل کے دھڑکتے قدموں کے نیچے سے سرک گئی ہیں

دل کو سہارا دینے والا اک ڈر ، من کو لبھانے والی ایک اداسی
جس کا کوئی ابد ہے اور نہ عدم ہے
پل بھر میری زیست کا حصہ رہے ہیں
گزرے دنوں کی خوشیاں آنے والے غموں کا جزو نظر آتی ہیں

16 ستمبر 1972

اور یہ انسان ، جو مٹی کا اک ذرّہ ہے ، جو مٹّی سے بھی کم تر ہے
اپنے لیے ڈھونڈھے تو اس کے سارے شرف سچّی تمکینوں میں ہیں ،
لیکن کیا یہ تکریمیں ملتی ہیں زر کی چمک سے ، سلطنتوں کی دھج سے ،
تہذیبوں کی چھب سے

نہیں !...... نہیں تو......!
پھر کیوں مٹّی کے اک ذرّے کو سجدہ کیا اک اک طاقت نے ؟
کیا اس کی رفعت ہی کی سب تسخیریں ہیں
میں بتلا دوں :
کیا اس کی قوت اور کیسی اس کی تسخیریں ؟
میں بتلا دوں
قاہر جذبوں کے آگے بے بس ہونے میں ۔ مٹّی کا یہ ذرّہ ،
اپنے آپ میں ، جب مٹّی سے بھی کم تر رہ جاتا ہے ، سننے والا اس کی
سنتا ہے ،
سُننے والا جس کی سنے وہ تو اپنے مٹی ہونے میں بھی انمول ہے ۔

24 ستمبر 1972

اور.....پھر اک دن ، میں اور تم جب ان اُونچی نیچی دیواروں کے
جھرمٹ میں اُترے
———جن میں کبھی ہماری روحوں کو زندہ چن دیا گیا تھا———،
اس وقت آنگن آنگن میں ترچھی کرنوں نے دھوپ کے کنگرے سایوں کی
قاشوں میں ٹانک دیے تھے

دیکھا ہوا سا کوئی سماں پرانا اُس دن ہم نے دیکھا
یوں لگتا تھا جیسے آسمانوں کی روشنیاں جھک کر اس اک قرئیے کو دیکھ
رہی تھیں
اور ہمیں تب وہ دن یاد آئے ، جب موت ہماری زندگیوں سے گزری تھی،
ایسی ہی صبحوں کی اوٹ میں !

ہم اُن زینہ بہ زینہ منڈیروں کے جُھرمٹ میں تھے
اور اس شہر کے لوگ اب بھی گلیوں میں خوانچے لگائے اپنی زندگیوں
کو بیچ رہے تھے ،
اور پھر ہم نے سوچا ، کون اچّھا ہے ، ہم جو مردہ چہروں سے جینے کی
خواہش پاتے ہیں ، یا وہ جو
ہم کو زندہ دیکھ کے ہماری موت کو مان لیتے ہیں !

ابھی ابھی تو میرے ساتھ تھے تم اے گزرے ہوئے زمانوں کے خیالو ،
پھر کب لوٹو گے
اک دن پھر بھی ، تمھارے ساتھ ، اس خاک کے تختے تک جاؤں گا
جس سے ڈھکے ہوئے بے نور گڑھوں میں کچھ نا دیدہ آنکھیں ،
ہم کو دیکھ کے ، اب بھی ہنس ہنس اٹھتی نظر آتی ہیں

28 ستمبر 1972

لیکن سچ تو یہ ہے ، صرف ہمیں جھٹلا سکتے ہیں اپنی جھوٹی سچائی کو ،
ورنہ اپنا حال تو یہ ہے ، ظاہر کرنے کو تو یوں ظاہر کرنا جیسے ہم
جیتے ہیں بس کچھ ایسے خود مست یقینوں میں ، جو
صرف ہمیں کو اپنے بارے میں حاصل ہیں
لیکن اندر ہی اندر یہ باور کرنا : آنے والی اگلی سانس تو بڑی کٹھن
ہوگی
جب تک ہم اپنے اس بہروپ کو ترک نہیں کر دیتے ،

زندگیوں کے برتاووں میں اپنے جھوٹ سے ہم لوگوں کو دہلاتے ہیں
اور اپنے سچ سے خود سہمے ہوئے رہتے ہیں ،

ایسا کون ہے جس کی طلب دنیا میں بے بہروپ ہے ،

اور خود مست آنکھوں کی ساحر ٹکٹکی اور لب بستہ حلقوموں کی مخفی
تلخی کے پیچھے تو ، جانے
کس کس مجبوری کا عمل ہے ،

کالی ریت کے جلتے صحراؤں میں شکم کی پیاس انھی خود مست آنکھوں
کے روشن روزنوں کے میٹھے چشموں کی چمک کو سونگھتی ہے '

لوگ کسی کو کتنا ہی بے فکر تفکّر والا سمجھیں ،
یہ تو اس کا دل ہی جانتا ہے ، وہ میٹھے چشمے کتنے دُور ہیں
جو لوگوں کو اس کی آنکھوں میں لہراتے نظر آتے ہیں

29 ستمبر 1972

''ہم تو اسی تمہارے سچ کے کباڑ میں تمہارے ساتھ یہیں پر کُ-رم کُرم
کِچ کِچ بستے ہیں—تم کیا جانو''

اکھڑی ہوئی جڑوں والی دیواریں گرتے گرتے ماتھے جوڑ کے جس کونے
میں ٹھٹک گئی تھیں
وہیں کہیں وہ چھوٹی سی میری دنیا تھی ، یہ بسرام تو تیاگ میں مجھ کو
ملا تھا—

''اور تمہیں کیا چاہیے ، مزے مزے سے ، بیٹھ کے ،
اپنے دانت اب کچکچاؤ تم اندھیروں سے اس بھرے ہوئے چھوٹے سے ڈبّے
میں ، یہ چھت جس پر ڈھکنا ہے !''

چونک کے میں نے دیکھا ، گلتے بُھربھرے کاغذ پر ، اک میری نظم کے
سارے حرف اب
اُن کے جبڑوں میں تھے— ،
اور تب میں نے سوچا : دھنسی پرانی لحدوں میں بل کھاتے کرمکوں
کی خوشدامنیں ، دیمکیں ،
سچ کہتی ہیں ، جو اس گدلی یکسوئی میں بیٹھ کے ، کالی روشنائی کے
ریزوں کو یوں کُرم کُرم چبتی ہیں ،

''لاکھوں حرفوں میں علموں کا جو گودا تھا ، اب وہ ان دانتوں کی
کترن ہے ،
تلواروں کی نوکوں سے لکھے ہوئے لفظوں کی صورت میں سرسراتی زنجیریں ،
اب ان آنتوں کی اُترن ہیں
سارے لیکھک اپنی لکھتوں میں پس گئے ان جبڑوں کے بیچ ، ان سب پر
دھوپ کفن تھی''

دیمکیں سچ کہتی ہیں ، واقعی باہر ، موت کی شرطوں پر جیتے ہیں
جینے والے ،
اکثر میرے تعاقب میں آئی ہیں ، اُن آنکھوں کی گردش کرتی کرگسی
پُتلیاں ،
آنکھیں ، جو یوں اپنی پلکوں پر میرے لفظوں کو تولنے میں میری
نبضوں کے بقایوں کو بھی گن لیتی ہیں !
''تم رہو ڈرتے عُقباؤں سے ، ہم سے جو پوچھو تو ھماری ھی سب گوتیں
ہیں جو
آخرتوں کے گوشت کدوں میں ، زعفرانی ڈوروں والی کافوری خلعتیں
اوڑھ کے
مزے مزے مٹّی چچوڑتی ہیں ، تم پڑے یونہی ڈرتے رہو اے لمبی ٹانگوں
والے انسانی سکوڑو''

8 اکتوبر 1972

کبھی کبھی تو زندگیاں ، کچھ اتنے وقت میں ، اپنی مرادیں حاصل کر لیتی ہیں ،
جتنے وقت میں لقمہ پلیٹ سے منہ میں پہنچتا ہے......اور اکثر ایسی مرادوں کی تو پہنچ بھی لقموں تک ہوتی ہے !

اور جب ایسی منزلیں بارور ہوتی ہیں تو شہر پنپتے ہیں اور گاؤں پھبکتے ہیں ، اور
تہذیبوں کی منڈیوں میں ، ہر جانب ، قسطاسوں کی ٹیڑھی ڈنڈیاں ، روز و شب ، تیزی تیزی سے
انسانوں کی جھولیوں میں رزقوں کی دھڑیاں اُلٹتی ہیں——، اور
بھرے ساجوں میں شدھ تلقینوں کی ڈونڈیاں پیٹنے والے بھی اپنی اپنی پیغمبریوں کی
تنخواہیں پاتے ہیں......،

لیکن کس کو خبر ہے ، ایسی بھی ہیں منزلیں، جن تک جانے والوں پر، نہ دُعا کا سایہ ہے نہ قضا کا گڑھا ہے !
کچھ ہے بھی تو بس اپنی سوچوں کی دھجّیوں میں سمٹی ہوئی اک بے چارگی
جس کی بے صدا ہوک میں عمریں ڈوب جاتی ہیں ۔

اور قطبوں سے قطبوں تک ، اُڑ اُڑ کر جانے والے ، تھکے پروں کی کہانیں بھی تو
اک منزل پہ چمکتی آبناؤں کی سمت لچک جاتی ہیں ۔
لیکن ہائے وہ منزلیں ، جن تک ہر سچائی رستہ ہے ، اور ہر سچائی موت کا جتیا نام ہے !

19 اکتوبر 1972

سب سینوں میں یکساں بٹے ہوئے ہیں علم اک دوسرے کے سب احوالوں
کے ،
اور سب سینے خالی ہیں اُن دانستوں سے ، جن میں یک جانی کی نشو و نما
ہوتی ہے !

اپنی اپنی اناؤں کے اِن بے تسنیم بہشتوں میں سب الگ تھلگ ہیں
ان کے علموں کی ڈالی پر استفہاموں کا میوہ نہیں لگتا

سب نے اپنی دانستوں سے اُبھرنے والے سوالوں کی جانب دروازے ،
اپنے دلوں کے ، مقفّل کر کے
چابیاں اب دوزخ کے پچھواڑے میں پھینک بھی دی ہیں ۔

ایسے میں اب کون سنے گا کسی کا شکوہ
اندر تو سینوں میں پہلے سے اتنا غوغا ہے اپنی ہی سانسوں کا !

راکھ کے ذرّوں سے زر ریزے نتھارنے والے اشک آلود خیالو
کہو تمہیں کچھ سوجھا اپنے غبار کی اوٹ میں
ہمیں تو پہلے ہی سے پتا تھا
مرنے سے پہلے لوگ اپنے جاننے والوں کے علموں میں مرتے ہیں

4 نومبر 1972

برسوں عرصوں میں ، اب نیندوں میں جاگے ہیں
خواب ،.....جو جاگتے دنوں کے آنسوؤں میں جیتے تھے ،
خواب ، جو کل بیداری میں بھی اپنے نہیں تھے ،
جو اب نیندوں میں بھی اپنے نہیں ہیں ،
صرف یہ آنسو ہمیشہ سے اپنے تھے، جن میں ان خوابوں کی جوت جلی تھی!

کسے خبر...... کیسی ہیں دوریوں کی یہ دنیائیں جو ،
برسوں عرصوں ، ہمارے دلوں سے بعید رہتی ہیں
اور اچانک، کبھی، ہم اپنی زندگیوں کو، ان کے چمکتے مدار میں پاتے ہیں،
پل بھر کو
پل بھر ، اتنے قریب تک آ کر - پھر وہ دوریاں ، اپنے سدیمی سفر پر
ہم سے......دُور اور دُور......ہو جاتی ہیں
اور ہمارے آنسوؤں میں اُن کے عکسوں کی قربتیں بھی دھندلا جاتی ہیں

کیسے ہیں یہ انجمیں قافلے ، جن کا پڑاؤ کبھی برسوں عرصوں میں، پل بھر
کو ، روحوں کے ساحل پر ہوتا ہے
تو وقتوں کے دریاؤں میں روشنیوں کے دودھ بہتے ہیں
اور پھر عمر بھر آنکھیں اپنے آنسوؤں میں اُن تسکینوں کو ترستی رہ
جاتی ہیں

7 نومبر 1972

آنے والے ساحلوں پر تو جانے کِن قدروں کی میزانیں ہیں

لیکن ان سب بھرے جہازوں کو دیکھو، یہ قد آور مستول اور مخملی بادبان
عرشے عرشے پر یہ بوجھل روحوں چکنی آنکھوں والے مسافر
کس نخوت سے، کن اطمینانوں میں تیرتے ہیں یہ بیڑے چمکتے پانیوں پر
اور ان میں لدے ہوئے یہ خزانے
آنے والے ساحلوں پر سب......مٹّی کے دانے ہیں

اور اس، ڈوبنے والے کو دیکھو، اک موج کے بل پر، آخری بار ابھر کر
دور سے اس نے باد بانوں کی دھندلی قوس کو کس حسرت سے دیکھا
اور اس کے دل میں وہ دولت تھی، آنے والے ساحل جس کی قیمت ہیں

اور......ان جیتی ہانپتی سڑکوں کے پتھریلے سمندر، مڑتے اور لہراتے
اپنی منجدھاروں اور اپنے ساحلوں کو یوں روز اُچھالتے ہیں میری نظروں کے سامنے، دنیاؤں اور عقباؤں کے اس سنگھم پر

اور میں خالی ہاتھوں سوچتا ہوں......کون ایسا ہے، جو ان سنگین
تریڑوں کے جب پار اترے، تو
اس کے پاس وہ سامگری ہو
آنے والے گھاٹ پہ جس کا مول ہے

1 دسمبر 1972

خورد بینوں پہ جھکی آنکھوں کی ٹکٹکی کے نیچے دنیا کے چمکیلے شیشے
پر اپنے لہو کی چکٹ میں، کلبلاتے
بے کل جرثومو،

دیکھو، تمہارے سروں پر گرداں خورد بینوں میں گھورتی آنکھیں تقدیروں کی
تم سے کیا کہتی ہیں.....سنو تو......
"بھرے کرے پر جُڑ جُڑ جیتے کرمکو، کب تک سورج کی کرنوں کا
میٹھا کیچڑ چاٹو گے...... گیلا ریتلا سرد اندھیرا ہے آگے تو......"

آگے تو جو کچھ ہو......
لیکن آج تمہارے جُڑے جُڑے جسموں کی لپٹوں اور تمہاری گتھم گتھا
روحوں کے گُچھّوں کے اندر جب میرے دبلے سے دل نے اچانک
اپنے اکیلے پن میں اپنا رخ اپنی جانب دیکھا ہے تو تم میں ہوتے ہوئے
بھی میرے دل کو تم پہ ترس آیا ہے

آگے تو جو کچھ ہو......
دنیا کے دھبّے میں بھری ہوئی ہم سب بے چہرہ بے کل روحیں، ہم سب
کلبلاتے جرثومے
آگے جو کچھ ہو——اک بار تو خود پہ ترس کھا کر دیکھیں......
شاید ہم کو دیکھنے کے لیے تقدیروں کو اپنی خورد بینوں کے زاویے
بدلنے پڑیں......

9 دسمبر 1272

صدیوں تک ، اقلیموں اقلیموں ، زندہ رہتا ہے ایک ہی جسم......
پگھلا ہوا بے جسم ، ـــــ اک جسم
اپنی چلن کے چولے میں

ایک ہی پیکر
جس میں روحیں آ آ کر اپنی میعادوں میں چکراتی ہیں ، کھو جاتی ہیں
زندہ رہتا ہے صدیوں کے کبڑے گھروندوں میں
زندہ ہواؤں میں ،

اور جب اُس کا زمانہ نیلے دھوؤں میں گہنا جاتا ہے
تو بھی......اُس کی زندگی لہک لہک جاتی ہے ، ان آنکھوں میں ، جو
گھنے گھنے باغوں کی طراوتوں سے بھر جاتی ہیں ، جب تانبے کی دیواروں
کے جنگل میں کہیں شنہائی کی دُھن بجتی ہے

کالے کھمبوں کی نوکیں جب آسمانوں کے سائبانوں کو چھید دیتی ہیں
تو بھی......سدا اک جیتی سوچ کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں سایوں کی
عمریں
جب کالے بادل گِھر گِھر کر آتے ہیں ۔

لوہے کی لچکیلی پٹڑیاں جب عفریتوں کے قدموں سے کڑ کڑاتی ہیں
تو بھی ، سدا اک گہری سانس کی نزدیکی میں سما جاتی ہیں ترستی دوریاں
شام کو جب تاروں کے اَبَد جل اُٹھتے ہیں

17 دسمبر 1972

اپنے دکھوں کی مستی میں اک وہ خنداں چہرا ، جو میرے لیے خنداں تھا
اور وہ اپنی اک جنبش سے دونوں جہانوں کی سب زنجیروں کو جھٹک دینے والی بے کل پلکیں ،——اور
وہ جذبیلی باغی آنکھیں......جو میری خاطر باغی تھیں

چاندنی میں کفنائے ہوئے ظلموں کی بستی کے ٹوٹے فرشوں پر
ان دو محرم سانسوں کے ادوار——اُن دو مونس قدموں کے زمانے
عجب ارادوں والی رات کے واقعے
جیتے واقعے
جن کے سامنے اپنے دل کی پسپائی کا میں شاہد ہوں ۔

میں شاہد ہوں جو کچھ بیتا ، اس سرکش مٹّی کی طینت میں تھا
وہ سب کچھ اُس طاغی دریا کی اک طغیانی تھی

دریا......جس نے صدیوں پہلے بھی اپنے رستے سے پلٹ کر اپنی ریت کی چادر پر ، اک جلتی روح کی خاکستر کو جگہ دی!
اک دنیا شاہد ہے......راکھ کی اس ڈھیری کے سامنے ، آج بھی
ارمانوں کی جبینیں جُھک جُھک جاتی ہیں ، جس طرح میری روح ہمیشہ
اس خنداں چہرے کی دھول میں جھکی ہے ، جب سے میرے دل دریاوں نے رستے بدلے ہیں

1 جنوری 1973

کالے بادل ، . ...تیرے خوف میں ڈوب کے میرے دریا رک جاتے ہیں
تیری رو کے ساتھ امڈتے اندیشوں کی بابت سوچوں یا ان چڑھتے پانیوں
کو دیکھوں
جن پر میری ناؤ رواں ہے ، ایسے ساحلوں کی جانب ، جو
میری آنکھوں میں بسنے والے چہروں کی اقلیمیں ہیں

تیری پرچھائیں سے ڈرنے میں اپنی حقیقت بھی مجھ کو پرچھائیں نظر
آتی ہے
مجھ اک سائے کے یہ خدشے اور تجھ ایک حقیقت کی یہ ہیبتیں
ایسے ضابطے کی ترتیبیں ہیں ، جس سے ان دنیاؤں کی نمو ہے

کالے بادل ، میرے ڈر کو جانچ اور اپنے دخانوں ہی میں بکھر کے گزر جا
ان دریاؤں سے اپنے سایوں کا بوجھ ہٹا لے
ان دریاؤں کو بہنے دے، جن میں میرے خیالوں کے یہ دھارے لہراتے ہیں
دھوپ ان پانیوں پر کھیلے گی تو وہ جزیرے چمکیں گے جو میری آنکھوں
میں بسنے والے چہروں کی اقلیمیں ہیں ۔

19 جنوری 1973

اندر سے اک دموی لہر اُبھر کر جب اُن کے چہرے کی وریدوں میں
پھر جاتی ہے اور
جب اس امتلا میں لوگ اپنی آنکھوں کے بے حرف تبسّم سے مجھ کو اپنے
دل کی اک تیکھی بات سناتے ہیں
تو میں کہتا ہوں "مولا ، تو نے دیکھا میں تیری اک کیسی دنیا میں
ہوں"

پل بھر آنکھوں کے گوشوں تک آ کے پلٹتی پُتلیاں ، مجھ کو اچانک
سامنے پا کر پہلے تو دانستہ آچٹ جاتی ہیں
اور پھر دوسرے لمحے ہنستی آنکھوں کی جھیلوں میں تیر کے میری جانب
جب کچھ اتنے تپاک سے امڈ پڑتی ہیں
تو میں کہتا ہوں "مولا تو نے دیکھا میرے یہ اتنے صادق رابطے تیرے
کیسے کیسے بندوں سے ہیں"

مجھ کو دیکھے بغیر جنہیں سب علم ہے میں کس عالم میں ہوں ، کچھ
ایسی آنکھیں جب میری جانب یوں تکتی ہیں
جیسے دنیا والے اک میّت کو اُس کے مرے ہوئے ہونے کے وثوق میں
تکتے ہیں
تو میں کہتا ہوں "مولا، ان لوگوں کو میری زندگی کی بھی خبر دے"

باھر گیلی گیلی سڑکوں پر ، سرما کے ٹھنڈے محرم جھونکوں کے ساتھ
اس پامال سہانی دھوپ میں
تھوڑی دور چلا ہوں تو اب میرا دل کہتا ہے :
"مولا تیری معرفتیں تو انسانوں کے جمگھٹ میں تھیں ، میں کیوں پڑا
رہا اپنے ہی خیالوں کی اس اندھیری کٹیا میں اب تک ؟"

22 جنوری 1973

دوسروں کے بھی علم سے باہر ہیں
وہ سب وابستگیاں جو میرے علم کی سرشاری ہیں
میرے علم سے باہر ہیں،
وہ سب وابستگیاں، جو دوسروں کے علموں میں عزیز ہیں

لیکن سب وابستگیاں..... سب کی وابستگیاں ان روحوں سے ہیں،
جو مٹّی میں
یکساں، یک منزل ہیں

اک اک قبر پہ جلنے والا دِیا گو الگ الگ گھر سے آتا ہے،
لیکن سارے دیوں کی روشنیاں مل کر مٹی کے اک ہی عالم میں
جھلملاتی ہیں
ایک ہی عالم، اپنے غیبوں میں ہر سُو حاضر، حاوی،
جس کے ڈانڈے اک اک دل سے ملے ہوئے ہیں

آسمانوں کے پیچھے
کہیں...... مٹی کے نیچے
جانے کہاں؟ بہتا ہے آنسووں میں لتھڑی ہوئی نسبتوں کا وہ دریا......
جس کی اُس اک رو کو ہی پہچانتا ہے ہر شخص جو صرف اُس کے دل
تک آتی ہے
وہ دریا جس کی طغیانیاں، ناموجود زمانوں کے ساحل سے چھلک ہماری
ان پلکوں سے ٹپکتی ہیں، تو
ہم کو ایک ایک دِیا اک اک تربت پر الگ الگ جل اٹھتا نظر آتا ہے۔

سب علموں کی یہ تفریقیں ہیں، ورنہ آنسو کب جانب دار ہوئے ہیں

5 فروری 1973

بستے رہے سب تیرے بصرے ، کوفے
اور نیزے پر ، بازاروں بازاروں گزرا ،
سر......سرور کا ! ؛

قید میں ، منزلوں منزلوں روئی
بیٹی ماہ عرب کی
اور ان شاموں کے نخلستانوں میں گھر گھر ، روشن رہے الاؤ !

چھینٹے پہنچے ، تیری رضا کے ریاضوں تک، خون شہدا کے
اور تیری دنیا کے دمشقوں میں بے داغ پھریں زرکار عبائیں !

سامنے ، لہو بھرے طشتوں میں ، تھے مقتول گلابوں کے چہرے ،
فرشوں پر ،
اور ظلموں کے درباروں میں ، آہن پوش ضمیروں کے دیدے بے نم تھے !

مالک ، تو ہی اپنے ان سب شقی جہانوں کے غوغا میں
ہمیں عطا کر
زیرلب تر تیلیں ، اُن ناموں کی ، جن پر تیرے لبوں کی مہریں ہیں

17 فرروی 1973

دو پہیّوں کا جستی دستہ تھام کے ، چلتے ، پھرتے ، میں نے
سدا اسی اک تول میں ، اک محسوس نہ ہونے والے چین سے ،
اس دنیا کو دیکھا ،
بڑھتے ، مڑتے ، کالے بھنور ، سڑکوں کے
اور دو رویہ وہ تختے پھولوں کے

پھول بُلاتے بھی تھے اور میں رک بھی نہیں سکتا تھا
وہ دو پیّے ارض و سما تھے ، وہ دو پیّے رک بھی نہیں سکتے تھے ،

پھولوں کے دو رویہ تختے......اکثر ان کی بابت سوچا
کبھی تو آ کر باہم جڑتے چلے جائیں یہ تختے
ان پیّوں کے ساتھ ساتھ ان میرے قدموں کے نیچے
آگے......دور......تک......جہاں بھنور ان سڑکوں کے مڑتے ہیں ۔

24 فروری 1973

بات کرے بالک سے . ...اور بولے رہ چلتوں سے
اک یہ ذرا کچھ ڈھلی ہوئی شوبھا والی کو ملتا ،

اُس کے سُتے سُتے سے بال اور پیلی مانگ سے کچھ سرکا ہوا آنچل
دُکھی دُکھی سی دکھنے کی کوشش کا دکھ
اُس کے چہرے کو چمکائے اور اس کے دل کو اک ڈھارس سی دے
بڑے یقینوں میں مڑ مڑ کر دیکھے جیسے کچھ رستے میں بھول آتی ہو ،
مڑنے میں وہ بات کرے اپنے پیچھے چلتے بالک سے ، لیکن بولے مجھ سے ،
میری جانب اپنی بات اور
اپنی نظر کو یک جا کرکے !

دیکھنے میں شاید میں اتنا بھلا مانس نہیں لگتا

24 فروری 1973

جب صرف اپنی بابت خیالوں کا اک دِیا میرے من میں جلتا رہ جاتا ہے ،
جب باقی دنیا والوں کے دلوں میں جو جو اندیشے ہیں اُن کے الاؤ مری
نظروں میں بجھ جاتے ہیں
تب تو یوں لگتا ہے جیسے کچھ دیواریں ہیں جو میرے چاروں جانب
اُٹھ آئی ہیں ، میں جن میں زندہ چن دیا گیا ہوں ،

اور پھر دوسرے لمحے ، اس دیوار سے ٹیک لگا کر،——اپنے آپ کو
بھول کر
میں نے اپنی روح کے دریاؤں کو جب بھی سامنے پھیلے ہوئے خود موج
سمندر کی وسعت میں سمو دیا ہے
میری قبر کی جامد پسلیاں اک غافل کر دینے والی سانس کی زد سے
دھڑک اٹھی ہیں !

لیکن اس اک بے بہا غفلت کو اپنانا بھی تو کتنا کٹھن ہے
پھر دیواریں میرے گرد اٹھ آتی ہیں......اور......

پھر خود آ گہی کا دھندلا سا مقدّس دِیا میری ہستی کی قبر پر ٹمٹمانے لگتا ہے

25 فروری 1973

پھر مجھ پر بوجھ آ پڑتا ہے ، اُن نظروں کا
جو دنیا میں واحد نظریں ہیں ، جو دنیا کی ہر شے میں مجھ کو دیکھتی ہیں......اک مجھ کو ،
اور یوں مجھ کو دیکھنے میں ان آنکھوں کے آنسو حائل نہیں ہوتے ، بلکہ پلٹ جاتے ہیں -

پھر اس بوجھ کے نیچے میری اپاہج معرفتوں کا بازو بڑھ کے مرے دل کی کھڑکی کو کھول دیتا ہے
جس کے کواڑوں سے پھر آ کر ٹکراتے ہیں
باہر زور سے چلنے والی غفلتوں کی آندھی کے تیز تیز جھونکے ! وہ کھڑکی زور سے بند ہو جاتی ہے ، اور
پھر ان سہمی ہوئی پتھریلی مستطیلوں سے ابل پڑتا ہے
اجلی اجلی زندگیوں کا دریا،
جس کا پانی اتنا مہین ہے سونے کے ذرّے اس میں تیرتے صاف نظر آتے ہیں
جن میں میرے خیال بھٹک جاتے ہیں
سر سے سارے بوجھ اتر جاتے ہیں
بجلی کے پنکھے کی طوفانی جھنکار میں
میرے چہرے پر ٹھنڈے جھونکے کی جھالریں بکھر جاتی ہیں ،
اور پھر یہ بھی نہیں میں سوچتا ؛ میں کس جنّت میں دوزخی ہوں

1 مارچ 1973

کیسے دن ہیں ، اب کے تو مجھ جیسے طاغی کو بھی ، جس کی غفلت اتنی دوختہ چشم ہے تو نے دکھائے
اپنے زمانے ، جب وہ غیب کدوں سے چھلک کر پت جھڑ کی صبحوں میں جھلک پڑتے ہیں ۔
اپنے چشمے ، جب ان میں بادل بہتے ہیں
اپنی جنّتیں ، جب وہ دوام کے بُور سے لد جاتی ہیں ۔

میں کب اس قابل تھا......
دنیا میں کون اس قابل تھا

دیکھ لے ، ان راہوں پر ، تیری دنیا کے لوگ ، اپنے قیمتی فرغلوں ، میلے کمبلوں میں ڈوبے ہوئے کتنے
بے نسبت پھرتے ہیں ، ان سست ہواؤں سے ، جو تیرے لاکھوں جہانوں کی گردش کا ثمر ہیں

8 مارچ 1973

اُن کو جینے کی مہلت دے ، جو تیرے بندوں کی خاطر جیتے ہیں ،
ورنہ......تو......اس نگری کا اک اک نگ کھوٹا ہے ،
——— کوئی نہیں جو ناتواں ذرّوں کا راکھی ہو۔
کون ان کا راکھی ہے ، صرف ان کی یہی دو آنکھیں ، جن کی نگہداری
میں زندہ ہیں یہ ناتواں ذرّے
ذرّے ، جن میں عزتیں ٹمٹاتی ہیں اس اک گھر کی ، جس پر محجوب
اندیشوں کی چھت ہے ،
اُن آنکھوں میں جلنے والے مقدّس ارمانوں کو روشن رکھ
میں اُن آنکھوں کے ارمانوں کے دُکھ میں جیتا ہوں
اُن کو جینے کی مہلت دے ، جن کے جیتے رہنے میں اس دکھ اس غم کی
عفّت ہے ،
اُن کے دن تھوڑے ہوں تو میری زندگی ان کو دے دے
اُس ہونی کے ہونے تک تو——اپنے ہونے تک تو——میں ہوں
اس وقفے کو ایسی راحتوں سے بھر دے ، کچھ ایسی راحتیں
جو میں اُن دو نگہدار آنکھوں کو دے سکوں ، حیائیں جن کی زندگی ہیں

21 مارچ 1973

جن لفظوں میں ہمارے دلوں کی بیعتیں ہیں ، کیا صرف وہ لفظ ہمارے کچھ
بھی نہ کرنے کا کفارہ بن سکتے ہیں
کیا کچھ چیختے معنوں والی سطریں سہارا بن سکتی ہیں ، اُن کا
جن کی آنکھوں میں اس دیس کی حد ان ویراں صحنوں تک ہے

کیسے یہ شعر اور کیا ان کی حقیقت ؟
نا صاحب ، اس اپنے لفظوں بھرے کنستر سے چلّو بھر بھیک کسی
کو دے کر
ہم سے اپنے قرض نہیں اترینگے
اور یہ قرض اب تک کس سے اور کب اترے ہیں ،

لاکھوں نصرت مند ہجوموں کی خنداں خنداں خونیں آنکھوں سے بھرے
تاریخ کے چوراہوں پر
صاحب تخت خداوندوں کی کتنی گردنیں بھی حل کر نہ سکیں یہ مسائل،
اک سائل کے مسائل ،
اپنے اپنے عروجوں کی افتادگیوں میں ڈوب گئیں سب تہذیبیں سب
فلسفے ، ....

تو اب یہ سب حرف ، زبوروں میں جو مجلّد ہیں ، کیا حاصل ان کا
جب تک میرا یہ دکھ خود میرے لہو کی ٹکسالوں میں ڈھل کے دعاؤں
بھری اس اک سیلی جھولی میں نہ کھنکے جو رستے کے کنارے
مرے قدموں پہ بچھی ہے !

24 اپریل 1973

غزل

اور اب یہ کہتا ہوں ، یہ جرم تو روا رکھتا
میں عمر اپنے لیے بھی تو کچھ بچا رکھتا

خیال صبحوں ، کرن ساحلوں کی اوٹ ، سدا ،
میں موتیوں جڑی ہنسی کی لَے جگا رکھتا

جب آسماں پہ خداؤں کے لفظ ٹکراتے
میں اپنی سوچ کی بے حرف لَو جلا رکھتا

ہوا کے سایوں میں، ہجر اور ہجرتوں کے وہ خواب
میں اپنے دل میں وہ سب منزلیں سجا رکھتا

انھی حدوں تک ابھرتی، یہ لہر جس میں ہوں میں
اگر میں سب، یہ سمندر بھی وقت کا رکھتا......

پلٹ پڑا ہوں ، شعاعوں کے چیتھڑے اوڑھے
نشیبِ زینۂ ایام پر عصا رکھتا

یہ کون ہے ، جو مری زندگی میں آ آکر
ہے مجھ میں کھوئے مرے جی کو ڈھونڈتا رکھتا

غموں کے سبز تبسّم سے کنج مہکے ہیں
سمے کے سَم کے ثمر ہیں ، میں اور کیا رکھتا

کسی خیال میں ہوں یا کسی خلا میں ہوں
کہاں ہوں ، کوئی جہاں تو مرا پتا رکھتا

جو شکوہ اب ہے یہی ابتدا میں تھا امجد
کریم تھا ، مری کوشش میں انتہا رکھتا

24 مئی 1973

صبح ہوئی ہے ، صبح جو نیندوں میں جینے والی اک موت سے جاگ اٹھنے
کی انگڑائی ہے ،
سونے والو ، تمہاری خاک آلودہ لمبی نیندیں ، میری اک اک شب کی
نیند کی ہمیشگیاں ہیں ،

سونے والو ، جیسی تمہارے وقتوں میں تھی ، اب بھی اُسی طرح سے ہے
یہ دُنیا
صبحیں ——— اور ان کے بعد آتی شاموں کے کالے جھونکے ، جن کے دامن
میں موت ہے نیندوں میں ابدائی ہوئی ۔

اور گلی کی ٹوٹی سلاخوں والی نالی تک آ کر ، جب اک بوڑھے نے
اپنے کھوکھلے پوپلے سے جبڑے کو عصا کے خم پر رکھ کے ، جنازہ
برداروں سے پوچھا :
"کون تھا ؟" ——— تو گدرایا ہوا اک ماتمی بولا
"کوئی مہلت مند تھا ، ہم تو کاندھا دینے چل پڑے اس کے ساتھ کہ وہ
سو برس جیا تھا"
اوراک بے آب آنسو کی سسکی ، جب
بھرے محلے کے دروازوں منڈیروں سے گزری تو موت کی لذّت سے سب
چہرے تمتما اُٹھے

یہ سب اپنے خواب ہیں ، سونے والو ،
خواب ہمارے جن میں تمہاری دنیا جاگتی ہے رے سونے والو !
ہر روز ، ان صبحوں میں ، اک اک شب کی موت کے ڈھلنے پر ، اک ان
دیکھے طائر کے گیت میں
مرنے والوں کے یہ بول ابھرے ہیں : "جیو..... جیورے..... جیو
جیورے !"

سوئے والو تمہیں خبر ہے،
اپنی ان نیندوں سے جاگ کے، جب میں تمہارے دھیان میں جیتا ہوں، تو
تمہاری نیندوں میں کفنائے ہوئے ارمان
مرے جینے میں جاگتے ہیں۔

29 مئی 1973

میرے دل میں غم کے......

میرے دل میں غم کے دشنے کی دھار اُتری ہے
دل کا اک ٹکڑا دل سے کٹ کر گرنے کو ہے ،
ایسے میں اک مونس سچائی ہنستی ہوئی میرے سامنے آتی ہے
اور میں اک ہاتھ سے اپنے دل کے گرتے ہوئے ٹکڑے کو دل پر
جوڑ کے کَس کے
گہرے کرب کی لذت میں مُسکا کر
دوسرے ہاتھ سے اُس کو بڑھ کے سلام کرتا ہوں

پھر میں دیکھتا ہوں ، دنیا والوں کی ملاقاتوں میں ہمیشہ ، ہر سچائی کا
اک ہاتھ تو صرفِ مصافحہ ہوتا ہے
اور دوسرا ہاتھ اتنی ہی مضبوطی سے اپنے دل کی گرتی ہوئی اک
پھانک کو
دل کے ساتھ دبائے ہوئے ہوتا ہے

سچّی بات جو دل کو لبھاتی ہے ، اک دل سے دوسرے دل تک ، کس
مشکل سے سفر کرتی ہے -
اتنی برکتوں والے سکر کی بھی کیا بات ہے -

30 مئی 1973

مطلب تو ہے وہی—— تم چاہے برف کے بلاکوں سے اک بھرے ہوئے
ریڑے کو کھینچو،——
[سامنے پل کی چڑھائی ہے، ہاں، دیکھ کے، بوٹ نہ پھسلیں......
اور اب تھم کے......آگے رستہ صاف ہے ، عینک کے شیشوں
کو پونچھو......چلو......چلو]
یا اک ڈسک پہ جھک کے لفظ تراشو ، اپنے دل کی چٹان کو توڑ کے ،
دونوں صورتیں ، ایک ہی بات ،

تمہیں تو اک ان دیکھے تاز یانے کی بے آواز آواز پر
عدل کی چکّی پیسنی ہے ، اور عدل کی چکّی میں خود بھی پِسنا ہے
اس چکّی سے گرتا ، گرم سنہری آٹے کا جھرنا ، تو جانے کس کس
کیفیت میں گندھے گا ،
اپنے جتنوں میں تم جن رتنوں کو ڈھونڈھ رہے ہو جانے کن پتنوں کے
پار ملیں گے ،

اس دوران کُرے پھسلتے رہیں گے
جسموں کی سوچی ہوئی لہروں کا فرش اس دریا پر ٹوٹتا جڑتا رہے گا ،

کہیں کناری دار آنچل کے بیضوی چوکھٹے میں اک چہرا
اک لب بستہ چہرا،
اپنے آپ پہ اپنی آنکھیں جھکائے
سوچے گا : تم اس کی جانب کب دیکھو گے !

1 جون 1973

اور کہیں ظلموں کی زد میں ، دکھ کی اک چیخ
اپنے دردوں میں بہ جائے گی ، یہ جان کے : تم امداد کو آ نہ سکو گے !
ہاں......تو......ڈر گئے نا ، تم......تم اور کر بھی کیا سکتے تھے
اک یہ ڈر ہی تو وہ تمہاری قوت ہے، تم جس پہ بھروسا کر سکتے ہو -

اک بار اور اپنی پوری قوت سے توجہ
ورنہ برف کے لفظوں میں سب آگ پگھل جائے گی

12 جون 1973

کچھ دن پہلے کی بارش کے بعد—— اب گیلی فضائیں ، سوکھ کے ، تڑخنے لگی ہیں
دھول کے ہلکے ہلکے آسماں جھکے ہوئے ہیں پانیوں پر ، جو
بھرے ہوئے ہیں دھان کی اک کیاری میں ، پکی سڑک کے ساتھ ساتھ

سورج گرد کے پیچھے چھپا ہوا ہے ،
کیسا دن ہے ،
صرف اک ٹھنڈے سے جھونکے کی کمی ہے ، جس کا گزر ان آسمانوں میں ہے نہ خیالوں میں ہے

پکّی سڑک پر صدہا پہیّے گردش میں ہیں ، کالے رزقوں کی سمت ، آگ لگی آوازوں کے ساتھ——اور
اک میں سوچتا ہوں : ہر شے پر ، گرد کی تہ کیوں ہے ، موت پر بھی اور زندگی پر بھی......

دل کہتا ہے :
شاید مینہ پھر بھی برسے گا

13 جولائی 1973

بچا کے رکھّا ہے جن کو غروبِ جاں کے لیے
یہ ایک صبح تو ہے سیرِ بوستاں کے لیے

چلیں کہیں تو سیہ دل زمانوں میں ہوں گی
فراغتیں بھی، اس اک صدقِ رائیگاں کے لیے

لکھے ہیں لوحوں پہ جو مردہ لفظ، ان میں جیئں
اس اپنی زیست کے اسرار کے بیاں کے لیے

پکارتی رہی بنسی، بھٹک گئے ریوڑ،
نئے گیاہ، نئے چشمۂ رواں کے لیے

سحر کو نکلا ہوں، مینہ میں، اکیلا... کس کے لیے
درخت، ابر، ہوا... بوئے ہمرہاں کے لیے

سوادِ نور سے دیکھیں تو تب سراغ ملے،
کہ کس مقام کی ظلمت ہے کس جہاں کے لیے

تو روشنی کے ملیدے میں، رزق کی خاطر
میں روشنائی کے گودے میں آب و ناں کے لیے

ترس رہے ہیں سدا خشت خشت لمحوں کے دیس
جو میرے دل میں ہے اُس شہرِ بے مکاں کے لیے

یہ نین—جلتی لووں جیتی نیکیوں والے،
گھنے بہشتوں کا سایہ ہیں ارضِ جاں کے لیے

ضمیرِ خاک میں خفتہ ہے میرا دل، امجد
کہ نیند مجھ کو ملی خوابِ رفتگاں کے لیے

14 جولائی 1973

ہر جانب ہیں دلوں ضمیروں میں کالے طوفانوں والے لفظ—ہزاروں گھنی بھووں کے نیچے، گھات میں
اب تو میرے لبوں تک آ بھی، حرفِ زندہ

ہر جانب گلیوں کے دلدلی تالابوں میں، بے ستر، ہراساں، کھڑی ہیں روحیں
قدم کھبے ہیں نیلے کیچڑ میں، اور ان کی ڈوبتی نظروں میں اک بار ذرا
تَیری تھی ان کی زندگی، ابھی ابھی، اک پل کو
اور اب پھر کالے طوفانوں والے لفظ ان کے لیے جانے کیا سندیسے لائے ہیں
ان کو زندہ رکھیو حرفِ زندہ:

مدتوں سے بے یاد ہے تو میرے نسیانوں میں، اے حرفِ زندہ
اب تو میرے لبوں پر آ بھی،
اب...جب میرے دیکھتے دیکھتے کالے طوفانوں والے لفظوں کا، آبی فرش، اک بچھ بچھ گیا ہے، دور افق کے پیچھے، کہیں اُن پانیوں تک، جن پر
اک نا خدا پیغمبر کی دعاؤں بھرے تَیرے تھے!

میرے نسیانوں میں جھنڈہ، حرفِ زندہ
تیرے معنوں میں موّاج ہیں وہ سب علم جو روحوں کو کھیتے ہیں اُس
اک گھاٹ کی سمت جہاں امید اور خوف کے ڈانڈے مل جاتے ہیں

اب تو، ساری دنیا میں سے جس اک شخص کو ڈوبنا ہے، وہ میں ہوں
اب تو ساری دنیا میں وہ شخص جو تیر کے بچ نکلے گا، میں ہوں

17 اگست 1973

کیا قیمت اس مٹی کی ، جو اب مٹی بھی نہیں ہے ،
آنسوؤں کے پانی سے نمک کا مالیدہ ہے ۔
لاکھوں رُتیں گلابوں کی اس میں کافور ہیں
اس مٹی میں سونے والے نام سدا باقی ہیں دنیا والوں کے حرفوں کے حنوط ، سے
اس کی اک ڈھیری پر آنکھیں میچ کے ہاتھ اٹھاؤ تو دھیان ایسے ایسے خیالوں کی جانب جاتے ہیں
جن سے دونوں جہاں زندہ ہیں !

لیکن ہائے وہ مٹی جو اب مٹی بھی نہیں ہے
جس پر صدیوں کے گارے کی تہیں ہیں
دیکھو تو یہ مٹی کہاں نہیں ہے ، کہاں کہاں یہ ہاتھ اٹھیں گے ۔
کس کو خبر ان ٹھیکریوں سے ڈھکی ہوئی ڈھلوان کے نیچے ، ان آہن ریزوں سے چنی ہوئی بنیاد کے نیچے
کس کس سونے والے کے کچے مسکن کی ڈاٹ ہے ، جس میں دئیے ابد کے ٹمٹماتے ہیں
کہاں کہاں یہ ہاتھ اُٹھیں گے ۔
چلتے چلتے ذرا ٹھٹک کر ، سوچو تو اک اک جھونکے میں لپٹ ہے ،
ایسے ایسے خیالوں کی ، جن سے یہ دونوں جہاں زندہ ہیں ۔

29 اگست 1973

اے ری صبح کی اجلی زرق برق گزر گاہوں پر چیختی——اُڑتی——
بے بس خوشبو،
یہ نفرت کی سلطنت تجھ کو بھی تو خرید سکتی ہے

تو نے یہ تو دیکھا ہوتا تیرا نظر نہ آنے والا بدن کن کن بدنوں پہ
لباس ہے
تجھ سے اور کیا ہو سکتا تھا۔
اس طرح اب جن پیرہنوں نے تجھ کو جھٹک دیا ہے
تو نے اُن کی سجل کریزوں پر یوں ٹوٹ کے گرنا ہی تھا،
کیسی ہیں یہ سپردگیاں جن میں سچ کی رمزوں کی پسپائی ہے!

تو نے دیکھا ہوتا، تو جن شستہ پہناووں پر یوں لہلوٹ ہے
اُن سے ڈھکے ہوئے جثوں میں، پل پل کیسے تریڑے پڑتے ہیں۔ اُس
زرد لہو کے

جو کالے رزقوں سے کشید ہوتا ہے
اے اس دنیا کی اچھائیوں کے تت ست میں پنپنے والی روحوں کی روح
کبھی تو تو ان باغوں سے بھی گزرتی
جہاں وہ سہکتے پھول نہیں کِھلتے، جو دوزخوں کی ٹھنڈک ہیں

16ستمبر 1973

اے دل ، اب تو کچھ ڈر
اپنے یقینوں سے ڈر
اپنے نہ ڈرنے سے ڈر
اب تو ، تو نے ' اپنے سپنوں میں ، خود سن لیے ایسے ایسے بول
ان سنے......سہانے
چلتی مشین گنوں سے چھدے ہوئے وہ بول اک ان جانی بولی میں
بول کہ جو مرنے والوں کی آخری کراہوں میں دم بھر کر جیئے تھے ،
جب چوبی کھمبوں سے
بندھے ہوئے اعضا اس کڑے کساؤ میں آزادی سے تڑپ بھی
نہیں سکتے تھے ،
اور کھمبوں سے ڈھلک گئے تھے
گولیوں سے دھنکے ہوئے ،
ریزہ ریزہ
خوں چکاں !
اور......وہ ان کے آخری مختصر ، بول سہانے ،
ان جانے وطنوں کے ترانوں کے وہ ٹوٹتے جُڑتے ماترے
اپنے اختیاروں میں اتنے بے بس اور اپنے اطمینانوں میں اتنے بے کل
وہ سب اتنے مقدّس حرف ، جو خواب میں ان سب تصویروں کے ساتھ
ابھرے تھے ،
خواب میں کتنے اچھے لگے تھے '......اور اب جاگنے میں تجھ کو یہ
اپنے آپ پہ حیرت کیوں ہے
اب وہ پنکھڑیاں اس عجلت سے جھٹک بھی دیں تو نے اپنے دامن سے
اے دل ' کچھ ڈر ،
اے دل ، کچھ دیکھ
کتنے قیمتی کتنے نازک ہیں یہ رابطے جن سے نظام ان تیری ٹک ٹک
چلتی راحتوں کے قایم ہیں
18 ستمبر 1973

اور ہمارے وجود ، ہمارے خیال ، ہماری عاجزیاں......سب اس کے
لیے ہیں
جس کو ان کی ضرورت بھی نہیں ، اپنی منشاؤں میں......اپنے فیصلوں
کے وقت !

سدا ، زمانوں زمانوں ، تہذیبوں تہذیبوں ، کیسے کیسے تمرد
والے قہقہے ،
اس کو بھلا دینے میں ابھرے ہیں ، جو ہمارے نسیانوں میں ہمیشہ
سے اک جیتی یاد ہے ،

اپنے آپ کو دیکھوں تو خود بھی اپنے گمانوں کے بارے میں کیسے
کیسے خیال رکھتا ہوں
میری حد تک فرق اتنا ہے ،
مجھ کو بھی اوروں کے جھوٹ نے روند ڈالا ہے ،
اب میں کس پر جھپٹوں اس سچائی کے بل پر ، جو مجھ میں ہے ، اور
جس کو جھٹلانے میں لگی رہی ہیں ، میرے لہو کی گردشیں

کچھ ہو......اس کے ہست کا اجرا یا اس کے عندیے کی قطیعت
کچھ ہو......ہر حالت میں......اس کو پسند ہے ، صرف اک وہ سچائی
جو سب سے پہلے ، مٹی کے اک پتلے کے دل میں سہمی ہوئی اتری تھی ،

ایک ہی سچا انسان اس کے سامنے رہا ہے ہر عالم میں ، لاکھوں تیرتی
ڈوبتی تہذیبوں کے درمیان

8 اکتوبر 1973

مل کر سب تعمیر کریں — اک ارماں
اک یہ ملک ، اور رزق اور گیت اور خوشیاں

جیتی مٹّی ؟ تیرے نام کی ٹھنڈک
میرے اک اک گرم آنسو میں پنہاں

گلی کوئی بے نام ، مکاں میں بے نمبر
ہے آباد مرا گھر ، کنعاں کنعاں

شفق دھلی میزوں کے گرد وہ چہرے
آنکھیں ، جن میں جئیں کسی کے پیماں

دور سے دیکھو ، اونچا پل اس شہر کا
پانیوں پر اک لوہے کی یہ کہکشاں

ذکر کا اک پل ، اس کمرے میں گراں......اور
اک بے مصرف سال کا چلّہ ، ارزاں

لوحیں طاق پہ ہیں اور ان کے نوشتے
تقدیروں میں تڑپنے والے طوفاں

دنیا...... اک دائم آباد محلّہ
اس اینٹوں کے ابد میں سارے انساں

23 اکتوبر 1973

غزل

پھر تو سب ہمدرد ، بہت افسوس کے ساتھ یہ کہتے تھے
خود ہی لڑے بھنور سے کیوں زحمت کی ؟ ہم جو بیٹھے تھے

دل کے علموں سے وہ اُجالا تھا ، ہر چہرہ کالا تھا
یوں تو کسی نے اپنے بھید کسی کو نہیں بتائے تھے

ساتھے جب سجدوں سے اُٹھے تو صفوں صفوں جو فرشتے تھے
سب اس شہر کے تھے ، اور ہم ان سب کے جاننے والے تھے

اہل حضور کی بات نہ پوچھو ، کبھی کبھی اُن کے دن بھی
سوزِ صفا کی اک صفراوی اکتاہٹ میں کٹتے تھے

قالینوں پر بیٹھ کے ، عظمت والے ، سوگ میں جب روئے
دیمک لگے ضمیر اس عزّتِ غم پر کیا اترائے تھے

جن کی جیبھ کے کنڈل میں تھا ، نیشِ عقرب کا پیوند
لکھا ہے ، اُن بد سخنوں کی قوم پہ اژدر برسے تھے

جن کے لہو سے نکھر رہی ہیں یہ سرسبز ہمیشگیاں
ازلوں سے وہ صادق جذبوں طیّب رزقوں والے تھے

30 اکتوبر 1973

بنے یہ زہر ہی وجہِ شفا جو تو چاہے
خرید لوں میں یہ نقلی دوا جو تو چاہے

یہ زرد پنکھڑیاں جن پرکہ حرف حرف ہوں میں
ہوائے شام میں مہکیں ذرا جو تو چاہے

تجھے تو علم ہے ، کیوں میں نے اس طرح چاہا
جو تو نے یوں نہیں چاہا ، تو کیا ، جو تو چاہے

جب ایک سانس گھسے ، ساتھ ایک نوٹ پسے
نظام زر کی حسیں آسیا ، جو تو چاہے

بس اک تیری ہی شکم سیر روح ہے آزاد
اب اے اسیرِ کمندِ ہوا ، جو تو چاہے

ذرا شکوہِ دو عالم کے گنبدوں میں لرز
پھر اُس کے بعد ترا فیصلہ ، جو تو چاہے

سلام اُن پہ تہِ تیغ بھی جنھوں نے کہا
جو تیرا حکم ، جو تیری رضا ، جو تو چاہے

جو تیرے باغ میں مزدوریاں کریں ، امجد
کھلیں وہ پھول بھی ، اک مرتبہ جو تو چاہے

14 نومبر 1973

ہر وقت فکرِ مرگِ غریبانہ چاہیے
صحت کا ایک پہلو مریضانہ چاہیے

دنیائے بے طریق میں جس سمت بھی چلو
رستے میں اک سلامِ رفیقانہ چاہیے

آنکھوں میں اُمڈے، روح کی نزدیکیوں کے ساتھ
ایسا بھی ایک دور کا یارانہ چاہیے

کیا پستیوں کی ذلّتیں، کیا عظمتوں کے فیض
اپنے لیے عذاب جداگانہ چاہیے

اب دردِ شش بھی سانس کی کوشش میں ہے شریک
اب کیا ہو، اب تو نیند کو آ جانا چاہیے

روشن ترائیوں سے اُترتی ہوا میں، آج
دو چار گام لغزشِ مستانہ چاہیے

امجد، ان اشک بار زمانوں کے واسطے
اک ساعتِ بہار کا نذرانہ چاہیے

19 نومبر 1973

غزل

صبحوں کی وادیوں میں گاؤں کے پڑاؤ تھے
دُور ، ایک بانسری پہ یہ دھن : "پھر کب آؤ گے ؟"

اک بات رہ گئی کہ جو دل میں ، نہ لب پہ تھی
اُس اک سخن کے ، وقت کے سینے پہ گھاؤ تھے

کِھلتی کلی کھلی ، کسی تاکید سے نہیں
اُن سے وہ ربط ہے جو الگ ہے لگاؤ سے

عیب اپنی خوبیوں کے چُنے ، اپنے غیب میں
جب کھنکھنائے قہقہوں میں من گھناؤنے

کاغذ کے پانیوں سے جو اُبھرے ، تو دور تک
پتھر کی ایک لہر پہ ، تختے تھے ناؤ کے !

کیا رو تھی ، جو نشیبِ افق سے مری طرف
تَیری ، پلٹ پلٹ کے ندی کے بہاؤ سے

امجد ، جہاں بھی ہوں میں سب اُس کے دیار ہیں
کتنے سہاؤنے ہوں کہ جنگل ڈراؤنے !

29 نومبر 1973

غزل

چمن تو ہیں نئی صبحوں کے دائمی ، پھر بھی
ہے میرے ساتھ ، لو اب ختم قرنِ آخر بھی

مری ہی عمر تھی جو میں نے رائیگاں سمجھی
کسی کے پاس نہ تھا ایک سانس وافر بھی

خود اپنے غیب میں بن باس بھی ملا مجھ کو
میں اس جہان کے ہر سانحے میں حاضر بھی

ہیں یہ کھچاؤ جو چہروں پہ آب و ناں کے لیے
انھی کا حصہ ہے میرا سکونِ خاطر بھی

میں اس جواز میں نادم بھی اپنے صدق پہ ہوں
میں اس گنہ میں ہوں اپنی خطا سے منکر بھی

یہ کس کے اذن سے ہیں ، اور یہ کیا زمانے ہیں
جو زندگی میں مرے ساتھ ہیں مسافر بھی

ہیں تیری گھات میں امجد جو آسمانوں کے ذہن
ذرا بہ پاسِ وفا اُن کے دام میں گر بھی

30 دسمبر 1973

یہ دن، یہ تیرے شگفتہ دنوں کا آخری دن
کہ جس کے ساتھ ہوئے ختم لاکھ دورِ زماں

چناب چین وہ دنیا، یہ عصرِ راوی رو
کبھی نہ ٹوٹنے والی رفاقتوں کے جہاں

وہ سب روابطِ دیرینہ یاد آتے ہیں
تیرا خلوص، تیری مخلصی، ترے احساں

مسرتوں میں لہکتے ہرے بھرے ایّام
قدم قدم پہ ترا لطفِ خاصِ ہمدمِ جاں

اور اب یہ تیرگیاں... اب کہاں تلاش کریں
وہ شخص، پیکرِ صدق، اور وہ فردِ فیض رساں

رہِ عدم کے مسافر، ذرا پلٹ کے تو دیکھ
گرفتہ جاں ہے ترے غم میں بزمِ ہم نفساں

ترے کرم کی بہاروں میں سوگوار ہیں، دیکھ
ترے چمن کے گل و سرو و لالہ و ریحاں

اُمڈ اُمڈ کے سدا گزرے گی غموں کی یہ موج
دلوں کی بستیوں سے تابہ ساحلِ دوراں

ابھی ابھی وہ یہیں تھا ۔ زمانہ سوچے گا...
انہیں گلوں میں ہیں اس کے تبسّموں کے نشاں

ابھی ابھی ان کنجوں میں اُس کے سائے تھے
ابھی ابھی وہ تھا ان براسدوں میں یہاں

کوئی یقین کرے گا اک ایسی عظمت بھی
کبھی تھی حصۂ دنیا، کبھی تھی جزوِ جہاں

ہمیں نے دیکھا ہے اس کو، ہمیں خبر ہے وہ شخص
دلوں کی روشنیاں تھا۔ دلوں کی زندگیاں

ہمیں خبر ہے، بڑے حلم و آبرو والے
ترا مقام کسی اور کو نصیب کہاں

زمانہ سوچے گا، وہ ایک کون تھا۔ تجھ سا
جو ان دیاروں سے گزرا تھا یوں گہر افشاں

اور اب جو تو نہیں، کچھ بھی نہیں، نہ ہم نہ حیات
ہر ایک سمت اندھیرا، ہر ایک سمت خزاں

جگہ جگہ تری موجودگی کو پاتے ہیں
ہمارے دردِ فراواں، ہمارے اشکِ رواں

ترے لیے جھکے مینائے کوثر و تسنیم
ترے لیے کھلیں درہائے روضۂ رضواں

1974

صحت نامۂ اغلاط

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۹	روضۂ ویراں	روضہ ویراں
۳	۱	گھنگھروں	گھنگھروؤں
۳	۷	گئی	گی
۵	۴	قباعیں	قبائیں
۷	۸	چھنٹے	چھینٹے
۷	۱۶	(یہ اضافہ کریں ''کتنے اندھے گیانی بھرے فیلسوف'')	
۱۱	۵	سمیع'' بصیر	سمیع و بصیر
۱۴	۸	پیالۂ گلِ	پیالۂ ِگل
۱۴	۱۸	زبجیر	زنجیر
۱۵	۱	پہ	بہ
۱۶	۹	جام	بام
۱۷	۱۰	یہ	بہ
۱۸	۷	زبجیر	زنجیر
۲۱	۴	کے	کہ
۲۲	۵	ہاہوں	بانہوں
۲۲	۵	مجھے	تجھے
۲۲	۱۰	منرد	مزد
۲۳	عنوان	غم نہ	غم ہے نہ
۲۵	۷	اک	ایک
۲۶	۱۳	ازرانی	ارزانی
۲۷	۲	گوش	کوش
۲۷	۱۴	کہستانوں	یخستانوں
۲۷	۱۸	فرو شندہ	خرو شندہ
۲۸	۶	فرش نشیں	فرشِ زمیں

۲۸	۱۳	آئی	آنی
۲۸	۱۵	ریگ گردوں	دیگِ گردوں
۲۸	۱۵	سے خم	سے اک خم
۲۸	۱۶	ریگ گردوں	دیگ گردوں
۲۸	۱۶	ابد رنگ	ابد زنگ
۲۸	۱۹	آگ آہی آگ	آگ ہی آگ
۲۹	۱۳	جہالوں	جھالوں
۲۹	۱۴	کڑے	کبڑے
۳۰	۵	راگنیون	راگینوں
۳۱	۱۲	فینبوس	فیبوس
۳۱	۱۴	دھوئیں کے بادل	دھوئیں کے دل
۳۲	۱۳	سیئے	کیے
۳۳	۳	ہڑھتا	بڑھتا
۳۳	۱۱	ر ہی	بانی
۳۴	۸	مجھکو	جھلکو
۳۴	۱۰	کرنوں	قرنوں
۳۵	۱۲	سلسے	سلسلے
۳۶	۱	گہٹاؤں	گھٹاؤں
۳۶	۵	دوروں	دردوں
۳۷	۷	حقہ برادر	تمباکو بردار
۳۷	۱۳	رتناسی	رتن آسن
۳۸	۶	گومے	گھومتے
۳۹	۱	دل	دن
۳۹	۸	سرِ ہگزار	سرِ رہگزار
۴۱	۱۱	دیکھے	دیکھیے
۴۴	۹	تیر	پیر
۴۴	۹	چھنک	جھنک
۴۶	۱۲	اک تری	یہ تری
۵۲	۶	گزرتے	گزرے
۵۲	۱۲	بابیں	باہیں
۵۲	۱۷	بھرے	بھرلے

۵۳	۱۳	موتیوں کھیپ	موتیوں کی کھیپ
۵۴	۸	جھمگھٹ	جمگھٹ
۵۴	۱۰	دھوئیں کے	دھوئیں کی
۵۴	۱۲	شکن	شکتی
۵۴	۱۷	بیب گوک	بیب کوک
۵۵	۲، ۴، ۶	ڈھونڈتا پھرا کے درمیان 'کوما' خارج کیجیے ۔	
۵۵	۱۴	کو بہ کو	سو بہ سو
۵۶	۳	فصل ، تیرا	فصلِ سم ترا
۵۹	۱۲	کے	کہ
۶۰	۵	بازوں	بازووں
۶۱	۴	قریب	فریب
۶۱	۵	دہلیز پہ یہ روندی	دہلیز پہ روندی
۶۱	۱۱	میں	ہیں
۶۱	۱۱	ہرف	ہدف
۶۴	۴	دونوں سطروں کو الگ الگ درج ذیل طریقے سے لکھیے :	
		لوٹ کر پھر نہ آنے والوں کی	
		منتظر منتظر چراغ بہ کف	
۶۶	۵	رنگ رنگ کے انگ	رنگ رنگ کے رنگ
۷۰	۵	بھی	ہے
۷۰	۶	بھی	ہے
۷۰	۸	ییرنے	تیرنے
۷۳	۴	مرتے	مرے
۷۶	۱۰	یوں اس نام	یوں اس اک نام
۷۷	۱۰	میں	ہیں
۷۷	۱۱	بھی	بھی
۷۹	۴	پیچان	پیچاں
۸۰	۹	بہ	یہ
۸۰	۱۲	مان	دان
۸۳	۱۴	شمعِ موج	اضافت خارج کیجیے
۸۵	۶	ہجومِ کرمک و کور	ہجومِ کرمکِ کور
۸۶	۶	پہ	بہ

۸۸	۱	کوئی اس راکھ کو اگر	اگر اس راکھ کو کوئی
۹۴	۱	پڑ گئے	پڑ کے ان
۹۴	۲	بھول کے	بھول کر
۹۵	۴	غم	خم
۹۷	۱	ذگر	نگر
۱۰۰	۱	نکالا	نکلا
۱۰۰	۲	گھاس پر	گھاس پہ
۱۰۰	۴	مسکی	مسلی
۱۰۰	۸	کھوئے	کھوٹے
۱۰۳	۱۱	پہ	پر
۱۰۳	۱۳	بھی	بھی
۱۰۳	۱۵	نیند کی نیند	نیند کی نند
۱۰۸	۱۰	مٹی	مٹّی
۱۰۸	۱۰	بھاگ	بھاگ
۱۰۹	۲	ایک	اک
۱۰۹	۳	رونما	رونما
۱۱۷	۵	ماتھے	ماتھوں
۱۱۹	۱۰	آگ	وہ آگ
۱۲۶	۲	چلی	جلی
۱۲۶	۱۳	دیکھا	دیکھ
۱۲۷	۷	ربط ، اپنے	ربط اور اپنے
۱۳۱	۳	ے مہر	بے مہر
۱۳۱	۵	بکھری	نکھری
۱۳۲	۱۶	ہستیوں	ہیبتوں
۱۳۵	۸	ہر	پر
۱۳۶	۶	مری	میری
۱۳۶	۷	ضنو	ضو
۱۳۷	۲	تیرے گیان	تیرے ہی گیان
۱۳۸	۲	تجھے	تجھے
۱۴۶	۳	ٹہری	ٹھہری
۱۴۶	۱۱	خرس	فرس

۱۵۲	۷	اسی سنہرے	اسی سنہرے شہر کے اندر
۱۵۴	۱۶	ے سطر	بے سطر
۱۵۷	۱۴	دھیان میں	دھیان ہیں
۱۶۰	۳	ٹیسیں بھی ہیں ،	ٹیس بھی ہیں اور
۱۶۲	۳	تیشے میں ، زخم میں	تیشے ہیں ، زخم ہیں
۱۶۲	۱۲	اقلمیں	اقلیمیں
۱۶۳	۱	والے	والوں
۱۶۴	۲	کبھی وہ دن	کبھی تو وہ دن
۱۶۷	۸	ٹیس ، گراہ	ٹیس ، کراہ
۱۶۷	۱۳	باٹیں	بانٹیں
۱۷۰	۴	ستوچا	سوچتا
۱۷۱	۸	انت اپنا کون	کون اپنا انت
۱۷۲	۱۰	یہ زہر	بہ زیر
۱۷۲	۱۲	آنگنوں	افگنوں
۱۷۵	۶	لمبی لمبی قطاروں	لمبی قطاروں میں
۱۷۷	۱	بوڑھا	بوڑھا بوڑھا
۱۸۰	۲	لہو کا اک	لہو کا تھا اک
۱۸۲	۱۷	صبح کو	صبح
۱۸۴	۹	کسیلا	کٹیلا
۱۸۵	۹	گ ہی	گرہیں
۱۸۵	۱۵	پر	پہ
۱۸۶	۱۰	ان کے ہاتھوں	ان ہاتھوں
۱۸۶	۱۱	وہ دیکھتے ہیں	وہ تو دیکھتے ہیں
۱۸۹	۱۵	سب کو بج	سب کچھ بج
۱۸۹	۱۵	ٹہرے	ٹھہرے
۱۹۱	۱	تالوں	تانوں
۱۹۱	۲	پہچاں	پیچاں
۱۹۴	۲	کھیوٹ ہیں	کھیوٹ میں
۱۹۴	۷	سایا ہے	سایہ تھا
۱۹۶	۲	بیل اب اس نالے سے	اور بیل اب نالے سے
۱۹۸	۶	ٹہرے	ٹھہرے

۲۰۰	۹	سورج کے گول	سورج کے چمکیلے گول
۲۰۰	۱۴	عیب	غیب
۲۰۱	۱۲	حانے	جانے
۲۰۲	۱۲	اک	ایک
۲۰۲	۲۱	بہتے	بہے
۲۰۴	۸	تصنح	تصنع
۲۰۷	۳	گیت	کبت
۲۱۲	۲	ہتی	ہتّی
۲۱۲	۹	زینی	زمینی
۲۱۳	۱۱	کیا	کیسا
۲۱۴	۹	اس پونجی	اس اک پونجی
۲۱۴	۱۱	جو دل سے	جو میرے دل سے
۲۱۵		(نوٹ: تاریخ یکم جنوری ۱۹۶۹ع کی بجائے یکم جنوری ۱۹۷۰ع پڑھیے)	
۲۱۵	۱	بیٹھے	بیٹھے بیٹھے
۲۱۵	۱۵	لہکی	مہکی
۲۱۸	۱۷	باعث	باوصف
۲۲۰		کرسی پر رسوں	کرسی پر اک رسوں
۲۲۰	آخری سطر	۹۶۹۱	۱۹۶۹
۲۲۳	۳	چھ توں	چھتوں
۲۲۵	۲	دھن میں اس کی	دھن اس کی
۲۲۷	عنوان	سہاں	سہا
آخری سطر		۲۷ جون	۲۷ جولائی
۲۲۹	۵	پشہ	پشتہ
۲۳۰	۲	جیون ہار سا ڈر	جیون ہار ڈر سا
۲۳۲	۲	خوىی	خوبی
۲۳۳	۱۸	گنہگار	گنہار
۲۳۴	۸	تسکین	تسکینیں
۲۳۶	۱۰	فرشتے ڈر کے مارے اپنی شمعین	فرشتے اپنی شمعیں
۲۳۶	۱۵	آنے والے دنوں	آنے والے میرے دنوں
۲۳۸	۱۰	تم کو	تجھ کو

۲۳۹	۷	بچھونوں	بچھونے
۲۴۴	۱۶	نیچ	پہنچ
۲۴۵	۱۵	ہیں	ہوں
۲۴۵	۱۶	سہ	سہہ
۲۴۷	٦	نہائی ہریاول	نہائی ہوئی ہریاول
۲۴۹	۳	کملا	کمھلا
۲۴۹	۱٦	اس اپنی دل کی	اس اپنے دل کی
۲۵۲	۴	آئی	آتی
۲۵۲	۱۷	زیانوں	زبانوں
۲۵۳	٦	ادھوا پن	ادھورا پن
۲۵۳	۱۰	اس دل میں	اس کے دل میں
۲۵۴		(نوٹ : بارھویں سطر کے بعد اس سطر کا اضافہ کیجیے -	
۲۵۴		"آنے والے دلوں کا دھن ہیں")	
۲۵٦	۲	حوالے	ذریعے
۲۵٦	۵	بھنور	بھنور
۲۵٦	۱۱	وہ بازو	وہ تیرے بازو
۲۵٦	۱۲	کڑکی	کڑکتی
۲۵٦	۱۳	تسکین	تسکینیں
۲۵۷	۵	ظاہر	طاہر
۲۵۷	۱۱	جوہر	جوہڑ
۲٦۱	۴	چنتا	جنتا
۲٦۱	۵	سارے عذاب	سب کچھ سارے عذاب!
۲٦۴	۳	تیری	تری
۲٦۴	۹	صفس	صفیں
۲٦۵	۱	ایسی آ گیں	ایسی ہی آ گیں
۲٦۵	۹	میں ڈھلتی ہیں	کے اندر ڈھلتی ہیں
۲٦۵	۱۴	شلعوں	شعلوں
۲٦٦	۱	ان کی مسکراہٹ	ان کی اک مسکراہٹ
۲٦٦	۳	نیندوں کے	نیندوں کا
۲٦٦	۱۹	ارے	اے رے
۲٦۷	٦	کاسۂ بد مست	کاسہ بدست

۲۶۹	۶	لجر	لجز
۲۶۹	۱۵	دل کے	دل میں
۲۷۱	آخری	۱۹۷۰	۱۹۷۲
۲۷۳	۳	جب بھی دیکھا ہے	جب بھی دیکھا
۲۷۳	۵	اس پشیمانی	اسی پشیمانی
۲۷۴	۱	قوس میں پہ	قوس میں یہ
۲۷۵	۱۰	اس کے پردے	اسی کے پردے
۲۷۶	۶	تب اچھے عملوں	اور اچھے عملوں
۲۷۷	۹	سب تو	سب کچھ تو
۲۷۸	۸	اس خبر کی	اس کی خبر
۲۷۸	۱۱	رینا	رہنا
۲۷۸	۱۴	مل کے مٹی	مل کے بھی مٹی
۲۸۳	۱۳	موقع پاکر ہر منزل	موقع پاکر خیر کی ہر منزل
۲۸۴	۱۶	روشنیرں	روشنیوں
۲۸۴	۲۰	اک	اس
۲۸۶	۷	دلوں	دنوں
۲۸۶	۱۴	ہم نے ہمیشہ	ہم نے تو ہمیشہ
۲۹۰	۱۷	تیری مسکراہٹ	تیری مردہ مسکراہٹ
۲۹۶	آخری سطر	۲۹۷۱	۱۹۷۱
۲۹۷	۱	کے	کہ
۲۹۷	۱۰	ہم صیغروں	ہم صفیروں
۲۹۷	۱۲	پوربوں میں	پوربوں اور
۲۹۹	۷	دہکتے	دھمکتے
۳۰۰	۵	ہم تو اپنی	اپنی
۳۰۰	۶	مر بھی چکے	مر بھی چکے ہم
۳۰۰	۱۱	ناموں کی	ناموں کو
۳۰۲	۳	کتنی	جتنی
۳۰۲	۹	تہذیب	تہذیبوں
۳۰۲	۱۲	بے مصرف	بے مصرف
۳۰۳	۴	دل کی عادت	علم کی عادت
۳۰۴	۱	بیھڑ	بھیڑ

۳۰۶	۶	صدیرں	صدیوں
۳۰۶	۱۲	طلسم رہی ہیں	طلسم ہیں
۳۰۶	۱۴	بھولیں	بھولیں
۳۰۷	۱۱	روحوں پہ	روحوں میں
۳۱۰	۲۴	رکھتا ہے	رکھتا ہے
۳۱۲	۱۸	اک اک کرکے	اک اک کرکے ، اک اک کرکے
۳۱۳	۱۱	جن ناموں کے ذکر	جن کے ذکر
۳۱۷	۷	جس	جن
۳۱۷	۱۲	الٹتے ہی اک روز اک	الٹتے ہیں تو روز اک
۳۱۸	۱۵	کس سانسوں	کس سانحے
۳۲۰	۱۲	ٹکڑا ہو	ٹکڑا ہے
۳۲۰	۱۳	ٹھوکر	ٹھوکریں
۳۲۱	۳	سمجھتے	سمجھے
۳۳۰	۳	اپنے بازوؤں	اپنے لمبے بازوؤں
۳۳۰	۸	جھانکتی فاتح فاتح	جھانکتی نازاں نازاں فاتح فاتح
۳۳۲	۷	جس کو پہچانتا ہوں	جس کو میں پہچانتا ہوں
۳۳۲	۱۵	جس	جن
۳۳۵	۱۵	روزنوں کے	روزنوں سے
۳۳۷	۱۱	مزے مزے مٹی	مزے مزے سے مٹی
۳۳۸	۲۲	جتیا	جیتا
۳۳۹	۹	دیں ہیں	دی ہیں
۳۴۰	۱۱	دور اور دور	دور اور دور تر
۳۴۰	۱۴	ساحل	ساحلوں
۳۴۲	۶	کرمکو کب تک	کرمکو تم کب تک
۳۴۴	۱۶	چہرے کی دھول	چہرے کے دھیان
۳۴۴	۱۶	دل دریاوں	دل کے دریاؤں
۳۴۷	۳	علم سے باہر	علم سے بھی باہر
۳۴۸	۱۲	جس کے ڈانڈے	جس کے الگ الگ ڈانڈے
۳۴۸	۱۲	تو ہی اپنے ان سب	تو ہی ان سب
۳۵۰	۶	آتی	آئی
۳۵۱	۱	اپنی بابت خیالوں	اپنی بابت اپنے خیالوں

۳۵۱	۱۰	کر دینے والی	کر دینے والے
۳۵۴	۹	نویں سطر کے بعد دسویں سطر چھپنے سے رہ گئی ہے جو یہ ہے : "یہ دکھ مجھ کو زندگی سے بھی عزیز ہے۔"	
۳۵۵	۱۰	سے بھرے	سے بھرے ہوئے
۳۵۷	۲۲	جیو ... جیورے	جِیُو ... جیورے
۳۶۰	۴	عینک کے شیشوں	عینک کے گیلے شیشوں
۳۶۰	۱۴	اس دوران کرے	اس دوران میں کرے
۳۶۰	آخری	تاریخ سہواً لکھی گئی ہے خارج کیجیے۔	
۳۶۲	۱۱	سوچتا ہوں ہر شے	سوچتا ہوں ہر سو ہر شے
۳۶۴	۸	جانے کیا	جانے کیا کیا
۳۶۴	۱۴	دعاؤں بجرے	دعاؤں کے بجرے
۳۶۴	۹	اب مٹی بھی	اب مٹی میں مٹی
۳۶۶	۱۰	تو نے دیکھا	تو نے یہ تو دیکھا ہوتا
۳۶۷	۷	دم بھر کر	دم بھر کو
۳۶۷	۱۰	سکتے تھے	سکے تھے
۳۶۸	۱۵	قطیعت	قطعیت
۳۷۰	۳	دل	دلوں
۳۷۲	۷	فیض	فوز
۳۷۳	۱۴	کنتجیں	کنجن
۳۷۳	۱۴	جنگل	جھنگڑ
۳۷۴	۲	لواب	تواب
۳۷۶	۱	ابھی ابھی ان	ابھی ابھی انہیں
۳۷۶	۲	ابھی ابھی وہ	ابھی ابھی تو وہ

وقت

صفحہ نمبر ۱۱۲ پر نظم وقت کا صحیح متن:

وقت ہے اک حریم بے دیوار
جس کے دوار آنگنوں میں، سدا
رقص کرتے ہوئے گزرتے ہیں،
دائروں میں ہزارہا ادوار!

بیتی بات اور آنے والی آن،
اس امروز اور اس فردا،
سب زمانے، تمام عرصۂ دہر،
وقت کی ایک تیز لہر کی عمر!

کل وہ سب کچھ تھا، جو کچھ آج بھی ہے
آج جو کچھ ہے، اُس زمانے میں تھا
جب وہ سب کچھ کہ جس نے ہونا ہے
ہو چکا تھا، یہ کھیل ہونی کے!

لاکھ قرنوں کے ان قرینوں میں
نہ کوئی دن نہ سِن، نہ یوم نہ عصر،
صرف اک پل، بسیط، بے مدت،
اپنے بھیدوں کی حد میں لامحدود،

اس کی یک رنگیوں میں یکساں ہیں
ہنستے سنجوگ بھی، بجھے دل بھی،
سلسلے سجتی سیجوں کے بھی،
مسئلے، مسلے مسلے پھولوں کے بھی

وقت بہتا ہوا وہ دھارا ہے،
جس کی رو خنجروں کی دھار نہیں،
وقت جیتی حقیقوں کا جتن
مرنے والے کبھی مرے ہی نہیں

اتنے پہلو ہیں اس پہیلی کے،
اور اک ہم، کہ جن کے علم کی لیم
ہے فقط انگلیوں کا لمس اور بس،
ہائے اندھی روایتوں کے طلسم

ترجمہ: رچرڈ ایلڈنگٹن

۲۹ جون ۱۹۶۲ء

اظہارِ سپاس

اغلاط نامے کی تصحیح و ترتیب کے لیے
ہم ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ،
جناب اسرار زیدی اور جناب سجاد میر
کے شکر گزار ہیں ——

مجید امجد اشاعتی کمیٹی



مجید امجد اشاعتی کمیٹی لاہور